اپریل ۱۹۹۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

• تحریک اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ: یا چناں کن یا چنیں

تذکرہ و تبصرہ — ڈاکٹر اسرار احمد

• ڈاکٹر محبوب الحق: حق کے محبوب یا صیہونیت کے ایجنٹ

امیر تنظیم اسلامی کا ۸ مارچ کا خطاب جمعہ

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

رفقاء تنظیم اسلامی توجہ فرمائیں !

مشاورتی تربیتی اجتماع برائے ملتزم رفقاء

(۱۹ تا ۲۲/ اپریل ۹۶ء)

رفقاء کی سہولت کے پیش نظر امیر محترم نے مشاورتی تربیتی اجتماع برائے ملتزم رفقاء کے شیڈول پر نظر ثانی فرمائی ہے اور اس کے دورانئے میں تخفیف کا فیصلہ کیا ہے۔ لہٰذا اب یہ پروگرام ان شاء اللہ مندرجہ ذیل شیڈول کے مطابق منعقد ہو گا۔

☆ خصوصی مشاورتی و تربیتی اجتماع برائے ملتزم رفقاء ۱۹/ اپریل امیر محترم کے خطاب قبل از نماز جمعہ سے شروع ہو گا اور ۲۲/ اپریل سوموار نماز ظہر تک جاری رہے گا۔ اس پروگرام کا ایک اہم حصہ ہمارے رفقاء کا عالمی سطح پر نئے فکری رجحانات سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے شام کے اوقات میں مرکزی انجمن کے زیر اہتمام **محاضرات قرآنی** کے پروگرام میں رفیق تنظیم جناب باسط بلال صاحب

"Modern man on the verge of Post-modernism, between Nietzsche and Iqbal"

کے موضوع پر انگریزی میں لیکچر زدیں گے۔ صبح کے اوقات میں ان لیکچرز کا اردو میں خلاصہ بیان کیا جائے گا اور اس موضوع پر مزید گفتگو اور سوال و جواب کی نشست ہو گی۔

مزید برآں

☆ تربیتی پروگرام برائے ذمہ دار رفقاء اب ۲۲/ اپریل سوموار نماز عصر سے شروع ہو گا اور ۲۴/ اپریل نماز ظہر تک جاری رہے گا۔

تمام ملتزم رفقاء سے التماس ہے کہ وہ ۱۹/ اپریل بروز جمعۃ المبارک ۱۱ بجے سے قبل قرآن اکیڈمی لاہور پہنچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

المعلن : چوہدری غلام محمد، معتمد عمومی، تنظیم اسلامی پاکستان

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اُوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد:	۴۵
شمارہ:	۴
ذوالقعدہ	۱۴۱۶ھ
اپریل	۱۹۹۶ء
فی شمارہ	-/۱۰
سالانہ زرتعاون	-/۱۰۰

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات
  قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال _____ ۳
حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ _____ ۵
تحریک اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ ۔ یا چناں کن یا چنیں!
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ حکمت تحریک و فلسفہ تنظیم _____ ۲۱
خالص دینی تحریک سے علیحدگی
امیر تنظیم کے مکتوبات سے انتخاب

☆ خطاب جمعہ _____ ۲۹
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا
مسجد دار السلام میں امیر تنظیم کا خطاب

☆ بحث و نظر _____ ۶۶
کیا موجودہ مسلمان حکومتیں "الجماعہ" ہیں؟
سید وصی مظہر ندوی

☆ گوشہ خواتین _____ ۷۶
○ سچائی
○ ناک کٹنے کا مسئلہ
طیبہ یاسمین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

زیر نظر شمارہ اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی دو ایسی تحریریں شامل ہیں جنہیں انہوں نے بطور خاص "میثاق" کے لئے ہی مدون و مرتب کیا ہے۔ "میثاق" میں امیر تنظیم کے خیالات و افکار بالعموم ان کے خطبات جمعہ کے حوالے سے قارئین کے سامنے آتے ہیں' براہ راست تحریر کی اشاعت کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ گو امیر محترم کے خطابات و تقاریر کو ٹیپ سے اتارنا اور پھر اسے مرتب کر کے شائع کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں ہے اور اس سے اصل ضرورت ایک حد تک پوری ہو جاتی ہے' تاہم اسے کسی طرح بھی "تحریر" کا نعم البدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایک طویل عرصے بعد' زیر نظر شمارے میں اس امر کی تلافی کا کسی قدر سامان ہو گیا ہے۔

امیر تنظیم نے متعدد بار احباب و رفقاء کے سامنے اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا عقدہ لسانی تو خوب کھولا ہے' لیکن ان کے قلم پر گرہ موجود ہے۔ چنانچہ کسی موضوع پر قلم اٹھانا اور کوئی مضمون تحریر کرنا' یہاں تک کہ کسی کو خط لکھنا بھی ان کے لئے کوہ گراں سے کم نہیں ہوتا جبکہ دروس و خطاب کی ذمہ داری نبھانا اس کے مقابلے میں انہیں بہت آسان محسوس ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ ان کی اس قوت بیان کا بیشتر حصہ قرآن حکیم کے مفہوم و معانی کے بیان کے لئے مخصوص رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ساتھ انہیں جو خصوصی ذہنی مناسبت عطا فرمائی ہے یہ شاید اسی کا مظہر ہے کہ قرآن کو بیان کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان کی طبیعت پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہوتا بلکہ باطنی انبساط و انشراح کی ایک کیفیت وہ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملے میں سورۂ مریم کی آیت ۹۷ میں وارد شدہ بشارت : فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا "کا ایک عکس اللہ نے انہیں بھی عطا فرمایا ہے۔ گزشتہ قریباً پندرہ سالوں سے ماہ رمضان المبارک کے دوران دورۂ ترجمہ قرآن کی ہر سال تکمیل اس کے بغیر ممکن نہ تھی' اور اب عمر کے اس حصے میں کہ جس میں قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں' گھٹنوں کی شدید تکلیف کے ساتھ انگریزی زبان میں ۱۵ پاروں تک دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کا بھی اس کے بغیر کوئی امکان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع قرآن حکیم کو امیر محترم کی زبان پر رواں کر دیا ہے' ان کے لئے اس کا بیان آسان بنا دیا ہے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالشُّكْر

☆ ☆ ☆

امیر تنظیم اسلامی کی پہلی تحریر جو زیر نظر شمارے میں "تذکرہ و تبصرہ" کے زیر عنوان شامل ہے' تحریک اسلامی کے بحران کے حوالے سے ہے کہ جس کا المیہ یہ ہے کہ اس کی باقاعدہ تاسیس کو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا اور وہ داخلی انتشار کا شکار ہو کر دو دھڑوں میں بٹ چکی ہے۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اس خلفشار کا اصل سبب تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل اور دستوری خاکے کی تدوین کے معاملے میں رونما ہونے والا اختلاف تھا جو اس تلخ صورتحال پر منتج ہوا۔ اس تناظر میں امیر تنظیم نے اس اہم بحث کو موضوع گفتگو بنایا ہے کہ ایک اسلامی تحریک کا تنظیمی ڈھانچہ کیا ہونا چاہیئے۔ اس معاملے میں اب تک جو تجربات ہوئے ہیں ان کی روشنی میں امیر تنظیم نے واضح کیا ہے کہ اس میں اسلاف سے ثابت شدہ نظام بیعت اور موجودہ جمہوری طرز جماعت کو باہم گڈمڈ کر کے کوئی تنظیمی ڈھانچہ بنانے کی کوشش سعی لاحاصل ثابت ہو گی۔ اس معاملے میں یکسوئی کے ساتھ کوئی ایک طرز جماعت اختیار کر لینا ہی عافیت کا راستہ ہے۔

امیر تنظیم کی دوسری تحریر جو کسی بھی اسلامی انقلابی تحریک سے علیحدگی جیسے اہم اور نازک موضوع سے متعلق ہے' بہت قیمتی اصولی مباحث پر مشتمل ہے۔ غلبہ و اقامت دین کے لئے قائم ہونے والی کسی بھی جماعت کے کارکنان کے لئے اس میں رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔

مذکورہ بالا دو تحریروں پر مستزاد امیر تنظیم اسلامی کے ۸/ مارچ کے خطاب جمعہ کو بھی شامل شمارہ کیا گیا ہے جس میں ملکی و بین الاقوامی حالات پر امیر محترم کا مفصل اظہار خیال شامل ہے۔

قرآن کالج لاہور۔ اہم اعلان

- اس سال بی اے سال اول میں داخلے' حسب اعلان' جون کے اواخر میں ہوں گے اور انٹر کے رزلٹ کا انتظار کئے بغیر یکم جولائی سے تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔
- لیکن --- ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں داخلے' حسب سابق' ستمبر کے اواخر میں ہی ہوں گے۔ تدریس کا آغاز ان شاء اللہ اکتوبر کے پہلے ہفتے سے ہو گا۔

اس ضمن میں فروری کے شمارے میں شائع شدہ اعلان کو منسوخ سمجھا جائے۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج' لاہور

تذکرہ و تبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

تحریکِ اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ

"یا چناں کن یا چنیں!"

"تحریک اسلامی" ایک جانب تو ادویات کے "جنرک ناموں" (GENERIC NAMES) کی طرح کا عمومی عنوان بھی ہے جس کے ذیل میں عالم اسلام کی جملہ احیائی تحریکیں شامل ہیں، لیکن دوسری جانب یہ ایک ایسی پاکستانی تنظیم کا "عنوانِ خاص" (BRAND NAME) یا اسم علم بھی ہے جو گزشتہ سال اپریل میں منصۂ شہود پر آئی تھی اور ایک سال سے بھی کم مدت میں تقسیم ہو کر دو دھڑوں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اور یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دونوں دھڑے ایک ہی نام اختیار کئے رکھتے ہیں اور مختلف سیاسی اور مذہبی تنظیموں (جیسے مسلم لیگ، جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان وغیرہ) کے مانند اپنے اپنے قائدین کے ناموں سے معنون "گروپس" کی صورت اختیار کرتے ہیں یا ان میں سے کوئی ایک اپنا نام تبدیل کر لیتا ہے!

"جنرک" اعتبار سے برعظیم پاک و ہند کی جماعت اسلامی اور عالم عرب کی الاخوان المسلمون ہوں جو لگ بھگ ساٹھ ستر سالوں سے مسلسل برسرکار ہیں، یا انڈونیشیا کی مجومی پارٹی ہو جو شروع تو ان کے ساتھ ہی ہوئی تھی لیکن بعد میں طویل عرصہ تک پس منظر میں رہی اور اب حال ہی میں دوبارہ منظر عام پر آ رہی ہے، یا ایران کے فدائین ہوں جو آغاز کے اعتبار سے تو ان سب ہی کے ہم عصر تھے لیکن پھر "پردۂ غیبوبتِ کبریٰ" میں چلے گئے ----ان سب کو ایک ہی عظیم تر تحریک اسلامی کی مختلف تنظیمی ہیئتیں قرار دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ جناب نعیم صدیقی کا یہ شعر کہ۔

"ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم
ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم"

ان سب پر بالکلیہ منطبق ہوتا ہے۔

یہ دوسری خالص مذہبی یا نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتوں سے اس اعتبار سے بالکل ممیّز' اور باہم ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام "دین" یعنی مکمل نظامِ زندگی ہے' صرف "مذہب" یعنی محض عقائد و عبادات اور چند معاشرتی رسومات و معمولات پر مشتمل انفرادی معاملہ نہیں۔ اور مسلمانوں کا اصل فرض منصبی "اقامتِ دین" ہے یعنی یہ کہ اسلام کو ایک مکمل سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام ----- یعنی POLITICO-SOCIO-ECONOMIC SYSTEM کی حیثیت سے بالفعل قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ سب تحریکیں یا تنظیمیں فرقہ واریت سے مبرا' اور فقہی و روحانی مسالک و مذاہب کے ضمن میں وسیع المشرب ہیں---- جبکہ' صرف ایک استثناء کے سوا' باقی جملہ مذہبی تنظیمیں خالص فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم ہیں اور اپنے اپنے مسلکوں سے متعلق عوام کے تعاون سے موجودہ سیاست کے مروجہ اصولوں کے مطابق کشاکشِ اقتدار میں اپنی بساط کے مطابق بھرپور طور پر شریک ہیں۔

وہ "واحد استثناء" جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تبلیغی جماعت کا ہے جو متعدد اعتبارات سے عجیب و غریب بھی ہے' اور اپنی مثال آپ بھی۔ اس لئے کہ اس کا تصورِ اسلام خالص "مذہبی" ہے' چنانچہ نہ یہ سیاسی ہے نہ انقلابی' بایں ہمہ یہ خود نہایت "متحرک" بھی ہے' اور حد درجہ فعال بھی۔ اسی طرح اگرچہ اس میں زیادہ تر ایک ہی مسلک و مشرب کے لوگ شامل ہیں (یعنی' حنفی دیوبندی) لیکن فرقہ واریت کو اس کی بنیاد میں ہرگز کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہے۔ مزید برآں اگرچہ اس کا تنظیمی ڈھانچہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے لیکن ع "ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!" کے مصداق اسے نہ ٹھیٹھ دینی اصطلاح کے مطابق "جماعت" قرار دیا جاسکتا ہے' نہ موجودہ دنیا کے مروجہ اعتبارات سے! اس لئے کہ ایک جانب نہ تو اس کی عہدِ حاضر کے مروجہ نظاموں کے مطابق کوئی بنیادی اور مستقل رکنیت (MEMBER SHIP) ہے' نہ کوئی تحریری دستور' اور دوسری جانب اگرچہ جب تبلیغی

گروپوں کی تشکیل ہوتی ہے تب تو باقاعدہ امیر مقرر کئے جاتے ہیں لیکن کم از کم فی الوقت اس کا نہ کوئی عالمی امیر ہے نہ پاکستان کی جماعت کا۔ گویا آنحضور ﷺ کے قول مبارک "لاجماعۃ الابالامارۃ" (سنن دارمیؒ) کے مطابق جماعت قرار پانے کی شرطِ لازم پوری نہیں ہوتی (اس لئے کہ مولانا انعام الحسنؒ کے انتقال کے بعد کسی ایک شخص کو "امیر" نہیں بنایا گیا بلکہ تین افراد پر مشتمل بورڈ بنا دیا گیا ہے' جس میں سے دو تو "صاحبزادگان" ہیں یعنی ایک امیر ثانی مولانا محمد یوسفؒ کے پوتے اور دوسرے امیر ثالث مولانا انعام الحسنؒ کے بیٹے' اور ایک معمر بزرگ ہیں۔)

ادھر "عظیم تر تحریک اسلامی" کی دو نمایاں ترین تنظیمی صورتیں یعنی غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی' اور عالمِ عرب کی الاخوان المسلمون امتدادِ زمانہ کے باعث طبعی طور پر شکست و ریخت کا شکار ہوئیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوکھ سے متعدد تنظیموں اور جماعتوں نے جنم لیا۔ مثلاً مصر کی الاخوان المسلمون کے مؤسس اور اولین مرشدِ عام شیخ حسن البنّا شہیدؒ کے ایک ساتھی اور ارادتمند شیخ تقی الدین نبہانیؒ نے ان کی زندگی ہی میں علیحدہ راستہ اختیار کر کے "حزب التحریر" کی بنیاد رکھی' پھر کچھ عرصہ کے بعد جناب عمر تلمسانی کی امارت کے زمانے میں اولاً "التکفیر والھجرۃ" نامی متشدد اور دہشت گرد گروہ علیحدہ ہوا' اور پھر "جماعتِ اسلامیہ" (جس کا تلفظ "گماعہ اسلامیہ" کیا جاتا ہے) علیحدہ ہوئی۔ اسی طرح جماعت اسلامی ہند بھی اول تو ہندوستان کی تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں خود بھی چھ جماعتوں میں تقسیم ہو چکی ہے (یعنی جماعت اسلامی پاکستان' جماعت اسلامی بھارت' جماعت اسلامی بنگلہ دیش' جماعت اسلامی کشمیر' جماعت اسلامی آزاد کشمیر اور جماعت اسلامی سری لنکا) دوسرے اس سے مختلف مواقع پر علیحدگی اختیار کرنے والوں نے بھی علیحدہ علیحدہ ناموں سے جماعتیں قائم کرنے کی متعدد کوششیں کیں جن میں سے پاکستان میں ایک راقم الحروف کی قائم کردہ "تنظیم اسلامی" ہے جو بحمد اللہ اکیس برس سے مسلسل مدھم رفتار لیکن مستقل مزاجی کے ساتھ' سوائے چند افراد کی وقتاً فوقتاً علیحدگی کے' کسی بھی بڑے شکست و ریخت سے محفوظ و مأمون رہتے ہوئے کام کر رہی ہے --- دوسرے نمبر پر حال ہی میں پنجاب میں مولانا مودودی مرحوم کے اولین رفیق کار اور مولانا

مودودی اور مولانا اصلاحی کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے بلاشبہ نمبر تین مصنف و مقرر جناب نعیم صدیقی صاحب کی امارت میں قائم ہونے والی "تحریک اسلامی" تھی' جس کے' جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' ایک سال سے بھی کم مدت میں دو ٹکڑے ہو چکے ہیں' جن میں سے نعیم صدیقی صاحب کا ساتھ دینے والا ٹکڑا دوسرے کے مقابلے میں تعدادِ ارکان کے اعتبار سے چھوٹا ہے۔ پاکستان میں گزشتہ پچاس (قمری) سالوں کے دوران میں اور جتنے اکابر یا اصاغر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے یا خارج کر دیئے گئے ان میں سے دوسرے متعدد حضرات نے بھی جماعتیں یا تنظیمیں بنانے کی کوشش تو کی لیکن کسی اور کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ اسی طرح میری محدود معلومات کی حد تک بھارت کی جماعت اسلامی سے بھی حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے چند حضرات نے علیحدہ ہو کر ایک نئی جماعت بنائی تھی جس کے سربراہ اس علاقے سے جماعت کے رکن اول مولانا محمد یونس مرحوم تھے' لیکن وہ بھی چل نہیں سکی تھی! (واللہ اعلم!)

پاکستان کی تاریخ کے ابتدائی دس سالوں کے دوران میں تحریک اسلامی یا تحریکِ اقامتِ دین' جماعت اسلامی کے عنوان سے' چند سو اراکین اور چند ہزار کارکنوں کی نہایت منظم' متحد' پُرجوش' اور انتھک محنت و مشقت' اور ایک شخصِ واحد یعنی مولانا مودودی مرحوم کی ہمہ جہت اور ہر اعتبار سے مسلّم اور متفق علیہ قیادت کی بنا پر بہت سی بڑی اور پرانی مذہبی و سیاسی جماعتوں پر بھاری رہی۔ تا آنکہ ۵۷-۱۹۵۶ء میں یہ ایک عظیم بحران سے دوچار ہوئی جس کے نتیجے میں اس کی قیادت کی پوری صفِ دوم اس سے علیحدہ ہو گئی۔ چنانچہ اس "خروج" (EXODUS) کے بعد جماعت اسلامی کی امارت کے لئے مولانا مودودی مرحوم کے بعد مولانا مودودی کے سینئر رفقاء میں سے میاں طفیل محمد صاحب کے سوا کوئی نہ بچا۔

اُس وقت جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والوں میں تین اشخاص سب سے زیادہ نمایاں ہوئے: ایک سابق امیر جماعت اسلامی پنجاب اور مدیر روزنامہ "تسنیم" لاہور جناب سعید ملک (مرحوم) جنہوں نے شدید جارحانہ انداز اختیار کیا اور جماعت کی پوری نوکر شاہی اور بعض اہم قائدین پر جھوٹ' فریب اور خیانت تک کے الزام عائد کئے اور باقاعدہ

پریس کانفرنس میں علیحدگی کا اعلان کیا۔ دوسرے ان سطور کا ناچیز راقم جس کا اختلاف خالص اصولی تھا یعنی یہ کہ "جماعت اپنے ابتدائی اور ٹھیٹھ اصولی' اسلامی' انقلابی رول کو ترک کر کے اب صرف ایک "اسلام پسند" قومی سیاسی جماعت کا رول اختیار کر چکی ہے جس سے رجوع لازمی ہے!" اور جو اپنی نوعمری اور بے بضاعتی کے باوجود "نمایاں" اس لئے ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے ایک مفصل بیان بھی تحریر کیا تھا (جو دس سال بعد ۱۹۶۶ء میں "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے سوا دو سو صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع ہوا) اور پھر اپنی تمام تر "بے کسی" کے علم الرغم ماچھی گوٹھ کے سٹیج سے مسلسل تین گھنٹے تک مولانا مودودی کی بعد از تقسیم ہند پالیسی پر تنقید کی "ناکام" کوشش بھی کی تھی۔ تیسرے نمبر پر مولانا امین احسن اصلاحی تھے' جو اگرچہ بقول شورش کاشمیری مرحوم مولانا مودودی کے "اینجلز" بھی تھے اور "حکیم نور الدین" بھی اور اس اعتبار سے تو بلاشبہ مولانا مودودی کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کی نمایاں ترین شخصیت تھے لیکن اس جائزہ میں انہیں تیسرے نمبر پر اس لئے رکھا جا رہا ہے کہ اگرچہ انہیں فی الجملہ سعید ملک صاحب کی باتوں سے بھی اتفاق تھا---اور میرے تجزیئے سے بھی وہ بہت حد تک متفق تھے' لیکن انہوں نے اپنی علیحدگی کی اصل اساس ان امور کو نہیں بلکہ صرف اس بات کو بنایا تھا کہ ان کے نزدیک مولانا مودودی نے شخصی طور پر "آمرانہ" روش اختیار کر لی تھی اور جماعت کا نیا دستور بھی "شورائیت" کی بجائے "آمریت" پر استوار کر لیا تھا۔ تاہم علیحدگی کے موقع پر جو خط و کتابت ان اعاظم رجال کے مابین ہوئی وہ اس اعتبار سے حیرت انگیز بھی ہے اور عبرت آموز بھی کہ مسلسل سترہ سال تک یک جان دو قالب رہنے والے انسانوں کے مابین دفعتہً غیظ و غضب' بدگمانی و بداعتمادی' اور طنز و استہزاء کی ایسی گھمبیر فضا کیسے پیدا ہو گئی۔ (یہ خط و کتابت میری تالیف: "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب" میں من و عن درج ہے۔)

کیفیت و نوعیت کے اعتبار سے تو اس سے ملتی جلتی' لیکن کمیت کے اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ عبرتناک مثال نعیم صدیقی صاحب کی "تحریک اسلامی" کے حالیہ بحران میں سامنے آئی ہے' کہ اپریل ۹۵ء میں جس شخص کو تقریباً بالاتفاق "امیر" چنا گیا تھا' اول تو چند

ہی مہینوں کے اندر اندر خود اسے اپنے قریب ترین ساتھیوں میں نجویٰ اور سازش کی بُو آنے لگی اور وہ محسوس کرنے لگے کہ انہیں محض "درشنی پہلوان" کی حیثیت دے کر کچھ ہوشیار لوگوں نے سارے اختیارات خود سنبھال لئے ہیں' اور اس کے ردِّ عمل میں ان کے قریبی ساتھیوں کے جو خطوط پندرہ روزہ "نشور" میں شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی محبوب ترین اور معتمد ترین شخصیت چندہ ماہ کے اندر اندر "ارذل العمر" کو بھی پہنچ گئی اور "مطلق العنانی" کے "فراق" میں عقل و منطق' اور عدل و انصاف کی جملہ حدود کو بھی پھلانگ گئی! نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے ایک جانب امیر نے مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ دونوں کو معزول کر دیا تو دوسری جانب مجلس شوریٰ نے امیر کو معزول کر کے نئے امیر کا انتخاب کرالیا۔ گویا وہ سب کچھ جو بالعموم مساجد کی انتظامی کمیٹیوں' سماجی انجمنوں' اور دیگر مذہبی و سیاسی جماعتوں میں ہوتا رہتا ہے "تحریک اسلامی" میں بھی ہو گیا۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعُون! ع "چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!"

ہمیں نہ مولانا مودودی کے خلوص و اخلاص میں شبہ تھا' نہ مولانا اصلاحی کے۔ اسی طرح اب نہ جناب نعیم صدیقی کے اخلاص میں کوئی شک ہے نہ ان کے سابقہ اہم رفقاء کے۔ بلکہ اُس وقت تو چونکہ راقم خود بھی ع "کون طوفاں کے تھپیڑے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو!" کے مصداق "بحران" کے تھپیڑے کھا رہا تھا لہٰذا اس کے جذبات میں صدمے کے ساتھ ساتھ غصے کی آمیزش بھی تھی---اب تو اس حالیہ بحران میں کسی بھی جانب سے شریک یا ملوث نہ ہونے کے باعث متذکرہ بالا صورتحال پر رنج و افسوس کے سوا کوئی ردعمل نہیں ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ میں نے تو اگست ۹۵ء کی تقریر میں بڑے شد و مد کے ساتھ جماعت اسلامی' تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی کے مابین "وفاق" کے قیام کی تجویز پیش کی تھی اور کسی مثبت ردعمل کا منتظر تھا (خصوصاً اس لئے کہ ایک جانب دو سو میل شمال سے پروفیسر خورشید احمد صاحب کے ادارے سے شائع ہونے والے ماہنامہ "دینی صحافت" سے حوصلہ افزاء تبصرہ موصول ہوا تھا تو دوسری جانب دو ہزار میل جنوب میں واقع بنگلور سے شائع ہونے والے ماہنامے "ینگ مسلم ڈائجسٹ" نے بھی پذیرائی کی تھی!) لیکن ع "ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال!" کے مصداق ابھی "کثرت میں وحدت" کی شان کا کسی ادنیٰ درجہ

میں بھی ظہور نہیں ہوا تھا کہ ع "خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے!" کے مصداق تفرقہ و تقسیم کا عمل ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ اور "تحریک اسلامی" خود دولخت ہو گئی!

راقم کے نزدیک اس حادثہ فاجعہ کا یہ پہلو اہم تر اور قابل توجہ ہے کہ چونکہ ابھی پالیسی یا طریق کار کے ضمن میں تو کسی اختلافِ رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا' لہٰذا نزاع کی کل بنیاد تنظیمی ڈھانچہ یا دستوری خاکہ ---- اور اس کے ضمن میں بھی یہ اہم اور اساسی مسئلہ ہے کہ اختیارات کے اعتبار سے زیادہ بھاری پلڑا "امیر" کا ہو یا "شوریٰ" کا؟ چنانچہ اس موقع پر جناب نعیم صدیقی نے جو باتیں کہی ہیں ان میں سے اہم ترین یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے سازش اور ریشہ دوانی کے ذریعے ایک "غیر اسلامی" دستور بنوالیا۔ جس سے ان کی مراد غالباً یہی ہے کہ اس کی رو سے مجلس شوریٰ کے مقابلے میں "امیر" بالکل بے دست و پا بنا دیا گیا ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جس پر اب سے ٹھیک پچاس سال قبل ۱۹۴۶ء میں غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی کے کُل ہند اجتماع منعقدہ الٰہ آباد میں بھی شدید اختلافِ رائے سامنے آیا تھا۔ یعنی جبکہ مولانا مودودی مرحوم اس کے قائل یا مدعی تھے کہ اسلامی نظمِ جماعت میں اصل اختیار "امیر" کو حاصل ہوتا ہے جو مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے کو "ویٹو" کر سکتا ہے' مولانا اصلاحی اس پر جازم تھے کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے "تابع" ہونا ضروری ہے۔ جس پر اُس وقت تو مولانا مودودی نے "حکمت عملی" کے تحت کسی قدر گھٹنے ٹیک دیئے تھے اور ایک پیچ در پیچ "مصالحتی فارمولا" قبول کر لیا تھا' لیکن دس سال بعد ان کا اصل ذہن پہلے تو اجتماع ماچھی گوٹھ کے موقع پر بقول مولانا اصلاحی "خلوتیانِ خاص" کی محفل میں اور پھر بھرپور طور پر کوٹ شیر سنگھ کے اجلاسِ شوریٰ میں سامنے آیا۔ جس کے نتیجے میں جماعت کے دستور میں پورا اختیار امیر کے ہاتھ میں مرکوز کر دیا گیا۔ جس پر مولانا اصلاحی یہ کہتے ہوئے جماعت سے رخصت ہو گئے کہ مولانا مودودی نے وہ بلی دوبارہ تھیلے سے نکال لی ہے جسے وہ اپنی دانست میں "گربہ کشتن روزِ اول" کے مصداق ۱۹۴۶ء ہی میں مار چکے تھے۔ (ان تمام تفاصیل کے لئے دیکھئے میری تالیف: "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب") بعد میں یہ دستور مولانا مودودی کی زندگی تک تو بالکل ٹھیک کام کرتا رہا' اس لئے کہ وہ تحریک اسلامی کے داعیٔ اول بھی تھے اور جماعت اسلامی کے مؤسس بھی' پھر

میاں طفیل محمد صاحب کے دورِ امارت میں بھی اس بنا پر چلتا رہا کہ جماعت کے ارکان کی اکثریت' صحیح یا غلط طور پر' یہ سمجھتی رہی کہ وہ مولانا مودودی کے "معتمد ترین" شخص ہیں' لیکن جیسے ہی قاضی حسین احمد "سریر آرائے امارت" ہوئے جماعت کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت "الامان" اور "الحفیظ" پکار اٹھی--- چنانچہ یہ اسی کے رد عمل کا مظہر ہے کہ "نومولود تحریک اسلامی" نے اپنے اساسی دستور میں بالکل برعکس رخ اختیار کر لیا اور "امیر" کو بالفعل "صدر" کی حیثیت دے دی!

بہرحال چونکہ ابھی تحریک اقامتِ دین کو بہت طویل سفر طے' اور نہایت کٹھن مرحلے سر کرنے ہیں' ضروری ہے کہ "عظیم تر تحریک اسلامی" سے عملی یا ذہنی وابستگی رکھنے والا ہر شخص اس اہم اور اساسی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اور خاص طور پر چونکہ ۱۱-۱۲/ اپریل کو "تحریک اسلامی" کے نعیم صدیقی صاحب سے باغی دھڑے کا اجتماع ہونے والا ہے' مناسب ہو گا کہ اس کے اربابِ حل و عقد اس معاملے میں راقم کی معروضات پر بھی غور فرمالیں جو خالصتاً اقامت دین کے عظیم تر مقصد' اور تمام تر نصح و خیر خواہی کے جذبہ سے پیش کی جا رہی ہیں۔

تاہم اس سے قبل کہ اس معاملے میں اپنی رائے پیش کی جائے' مناسب ہے کہ اس خط کا اقتباس سامنے آ جائے جو راقم نے ۲۲/ جنوری ۹۵ء مطابق یکم رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کو نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا:

> "کل آپ سے حاضری کی اجازت حاصل کر کے گاڑی کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ تین گاڑیوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ TAXI بھی فوری طور پر نہ مل سکی۔ اور بعد میں پے بہ پے ایسی مصروفیات نکل آئیں کہ حاضری نہ ہو سکی ----- اب کل علی الصبح امریکہ کے لئے روانگی ہے' لہٰذا عریضہ ہذا کے ذریعے ہی حاضر ہوں!
>
> اگرچہ میرا یہ مقام ہرگز نہیں ہے کہ میں آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں' لیکن حدیثِ نبویؐ "الدِّینُ النَّصِیحۃ" کی رو سے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے دو درخواستیں پیش خدمت ہیں:

ایک یہ کہ آپ تحریک اسلامی کے تنظیمی قضیہ سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ کر کے' صرف تصنیف و تالیف کے کام میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مشغول ہو جائیں۔ اِس وقت جو صورت بن گئی ہے اس سے جگ ہنسائی تو ہو ہی رہی ہے---- "بعد از خرابیٔ بسیار" بھی کسی خیر کی کوئی امید نہیں ہے---- اور اس سے لامحالہ "عظیم تر تحریک اسلامی" کو بہت گزند پہنچے گا۔ مجھے خوب اندازہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں جب ایک بار "پیچ پڑ جائے" یا "سینگ پھنس جائیں" تو اس سے باہر نکلنا بہت مشکل اور بہت بڑے ایثارِ ذات ہی کے ساتھ ممکن ہے' تاہم میری مخلصانہ درخواست یہی ہے کہ آپ یہ کڑوا گھونٹ بھر لیں--- آپ کو بخوبی اندازہ ہو گا کہ میری ساری نیاز مندی آپ کی ذات سے ہے' دوسری طرف جلیل خان صاحب ہوں یا کوئی اور میری تو ان سے پہلی ملاقات بھی آپ ہی کے واسطے سے ہوئی ہے۔ اور اگرچہ اب میرا کوئی تنظیمی یا جماعتی تعلق نہ جماعت اسلامی سے ہے نہ تحریک اسلامی سے' تاہم مجھے عظیم تر تحریک اسلامی کی عزت اور نیک نامی بھی عزیز ہے کہ اس کی رہی سہی اور بچی کھچی پونجی بھی ختم نہ ہو جائے---- اور اللہ گواہ ہے کہ ذاتی طور پر آپ کی عزت اور وقار کا بھی تہہ دل سے خیال ہے...."

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ ------ "اقامتِ دین" کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی تنظیم یا جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کے مسئلے پر راقم نے ۵۷-۵۶ء ہی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا' اور بحمد اللہ راقم کی ایک رائے بھی اواخر ۵۸ء ہی میں بن گئی تھی' اگرچہ اس پر عمل کا آغاز لگ بھگ بیس سال بعد ۷۷ء میں ہوا۔ اور درمیانی عرصے میں راقم متبادل صورتوں پر بھی عمل کے لئے ذہناً و قلباً پوری طرح آمادہ رہا۔

راقم کی وہ رائے جو اب مزید تقریباً بیس سال گزرنے کے بعد کافی بڑے حلقے میں معلوم و معروف ہے' یہ ہے کہ ----اگرچہ عہدِ حاضر کے جملہ جمہوری و دستوری نظام ہائے جماعت بھی شریعت کی رو سے حرام یا ممنوع نہیں' بلکہ اصلاً مباح ہیں۔ (یہاں تک کہ ایک دستور کے ساتھ "حلف وفاداری" بھی ایک طرح کی دستوری "بیعت" ہی ہے!) تاہم

واحد منصوص و مسنون و ماثور طریقہ "شخصی بیعت" کا ہے!---مزید برآں یہی کسی انقلابی جدّوجہد کے لئے عقل و منطق کی رو سے بھی زیادہ درست اور مفید تر ہے!

تاہم زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے بالکل متمیز بلکہ متضاد ہیں جن میں سے بالکل "یا چناں کن یا چنیں" کے مصداق کسی ایک کو بتمام و کمال قبول کر لینا چاہئے۔ اصل خرابی ان دونوں کے مابین "پیوند کاری" سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اصلاً ایسی پیوند کاری ہی کے نتیجے میں جماعت اسلامی اپنے ۵۷-۵۶ء والے شدید ترین بحران سے دوچار ہوئی تھی اور اسی کے باعث اب نوزائیدہ "تحریک اسلامی" اپنے حالیہ بحران کا شکار ہوئی ہے۔ اور دونوں مواقع پر تلخی' تندی' تیزی' جھنجلاہٹ' اور ان سب سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کی نیتوں تک پر حملے کی مکروہ ترین صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔

شخصی بیعت کا نظام کسی ایک "داعی" کی ذات سے شروع ہوتا ہے' جو پہلے انبیاء معصومین ہوا کرتے تھے' اور ختمِ نبوت کے بعد غیر نبی اور غیر معصوم انسان ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ داعی سامنے آتا ہے' اپنے خیالات و نظریات کی اشاعت کرتا ہے' اور اپنے ہدف اور طریق کار کی بھی وضاحت کرتا ہے' اور پھر "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ" کی صدا بلند کرتا ہے۔ پھر جو شخص اس سے فی الجملہ متفق بھی ہو اور اس کے خلوص و اخلاص پر اعتماد بھی کرتا ہو وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کا "ساتھی" بن جاتا ہے۔ اور اپنے "سمع و بصر و فواد" سے صرف یہ دو کام لیتا ہوا اس کی اطاعت پر کاربند رہتا ہے کہ اولاً مقدور بھر خود بھی غور و فکر کرتا رہے اور پیش آمدہ مسائل و مراحل کے ضمن میں اپنی رائے بھرپور طور پر پیش کرتا رہے' اس سے بالکلیہ قطع نظر کہ وہ قبول کی جائے یا رد کر دی جائے! اور ثانیاً یہ دیکھتا رہے کہ "داعی" جو اب "امیر" کی حیثیت رکھتا ہے کہیں کتاب و سنّت کی حدود سے تجاوز نہ کر جائے! گویا کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اندر اس امیر کی حیثیت "آمر" کی ہے۔ (واضح رہے کہ عربی قواعد کی رو سے "آمر" اسم فاعل ہے جس میں ایک طرح کا عارضی پن شامل ہوتا ہے' جبکہ "امیر" صفتِ مشبہ ہے جس میں دوام و استمرار کا رنگ پایا جاتا ہے!)---اس طرح یہ جماعت اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتی ہے' اور اس میں نہ کبھی امیر کا انتخاب ہوتا ہے نہ ہی کبھی فیصلوں کے لئے آراء کی گنتی کی جاتی ہے---مزید برآں'

اس نظام جماعت میں مناصب کے لئے "امیدواری" بھی نہایت ناپسندیدہ شے ہے۔ رہی کنوینگ' نجوئی اور گروہ بندی تو وہ تو گناہ کبیرہ کے درجہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس مغرب نے ریاست اور جماعت کے لئے جو جمہوری اور دستوری نظام صدیوں کے عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں DEVELOPE کیا ہے وہ نیچے سے اوپر کی طرف چلتا ہے۔ چنانچہ اس کی اساس "شہریت" یا "رکنیت" پر ہے۔ اور اوپر کے جملہ مناصب درجہ بدرجہ "انتخابات" کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ پھر ہر سطح پر منصب داروں یا عہدیداروں پر CHECKS AND BALANCES کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مجالس منتظمہ یا مجالس قانون سازیا مجالس مشاورت بھی انتخابات ہی کے ذریعے وجود میں آتی ہیں اور پھر عہدیداروں اور ان مجالس کے مابین تقسیم اختیارات کے پیچ در پیچ فارمولے بنائے جاتے ہیں اور اگر "صدور" کے اختیارات غالب ہوں تو وہ نظام "صدارتی" بن جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر مجالس کی کثرت رائے صدور پر "حاکم" اور "لازم" بن جائے تو اسے "پارلیمانی" کہا جاسکتا ہے---- بہرحال اس نظام میں سربراہ "صدر" کہلاتے ہیں "امیر" نہیں!

لیکن اہم تر معاملہ یہ ہے کہ اس نظام میں کھلم کھلا امیدواری اور کنوینگ' اور اعلانیہ دھڑے بندیاں اور بلاک سازیاں اجزائے لاینفک کی حیثیت رکھتی ہیں' اور ہرگز نہ معیوب ہیں نہ غیر مستحسن' بلکہ CHECKS AND BALANCES کا پورا نظام بنتا ہی ان کی بنا پر ہے۔ چنانچہ حال ہی میں لاہور میں امریکہ کے کونسلیٹ سے منسلک کلچرل اٹیچی مسٹر رمونی ملاقات کے لئے تشریف لائے اور ان سے عہد حاضر میں نظام خلافت کے دستوری ڈھانچے کے موضوع پر مفصل گفتگو ہوئی تو انہوں نے صاف فرمایا کہ ہمارا تو سارا نظام تعمیر ہی اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ ہر شخص چور اور بے ایمان ہے اور دستوری اور قانونی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعے چوری اور بے ایمانی کو کم سے کم کیا جاسکے!

بیسویں صدی عیسوی کے دوران ہندوستان کے ہندوؤں نے دو عظیم جماعتیں قائم کیں۔ ایک خالص سیاسی یعنی انڈین نیشنل کانگرس جو صد فی صد جمہوری اور دستوری تھی۔ چنانچہ اس میں امیدواریاں بھی ہوتی تھیں اور کنوینگ بھی۔ گویا الیکشن باقاعدہ

"لڑے" جاتے تھے۔ مزید برآں دھڑے بھی کھلم کھلا بنتے تھے اور بلاک بھی اعلانیہ بنائے جاتے تھے اور ان کے مابین رسہ کشی بھی برملا ہوتی تھی۔ ان ہی کیفیات کے ساتھ اس جماعت نے آزادی کی جدوجہد میں بھی اپنا کردار ادا کیا' اور پھر آزادی کے بعد بھی اب تک یہ جماعت بھارت کی حکومت کو چلا رہی ہے۔ اس جماعت نے ہمیشہ ایک خالص مغربی انداز کی سیاسی پارٹی کا رول ادا کیا اور اپنے جملہ امور کی گاڑی کو ہمیشہ دستور کی پٹڑی ہی پر چلایا۔ تاہم واضح رہے کہ جدوجہدِ آزادی (یا جہادِ حریت) کے دوران جب بھی کبھی "راست اقدام" کا مرحلہ آتا تھا تو یہ اپنے صحیفۂ دستور کو بند کر کے رکھ دیا کرتی تھی اور یکے بعد دیگرے "ڈکٹیٹر" نامزد کر دیئے جاتے تھے۔ اس لئے کہ "تحریک" چلانے کے لئے یہ شے ناگزیر برائی کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ہے مذہبی اور احیائی جماعت "آر ایس ایس" کا کہ اس کا سربراہ "صدر" نہیں "گورو" ہوتا ہے جو منتخب نہیں ہوتا بلکہ سابق گورو کا نامزد کردہ ہوتا ہے' جو اسے اپنے دورِ سربراہی ہی میں نامزد کر کے زیرِ تربیت رکھتا ہے جو اس کے انتقال پر "تاحیات خلیفہ" بن جاتا ہے۔ چنانچہ ۲۵ء سے ۹۵ء تک ستر سالوں میں اس کے داعی اور مؤسس کے بعد دو گورو تو سابق گوروؤں کے انتقال ہی پر گورو بنے' البتہ اب چوتھے گورو کو تیسرے ہی نے خود نامزد کر کے اپنی علالت کے باعث اپنی زندگی ہی میں سربراہی سونپ دی ہے۔

اس جماعت کی وسعت اور قوت کا عالم یہ ہے کہ اب سے دس برس قبل اس پر ایک کتاب شکاگو سے "BROTHERHOOD IN SAFFRON" کے نام سے شائع ہوئی تھی تو اس میں اس کے تربیت یافتہ والنٹیرز کی تعداد پچیس لاکھ بتائی گئی تھی۔ (اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سالوں کے دوران بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہو گی!) اور اس کے نظم و ضبط اور ڈسپلن کی پابندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اجودھیا کی مسجد کو شہید کرنے کے لئے اس کے تین لاکھ والنٹیر ہندوستان کے کونے کونے سے اجودھیا پہنچے۔ لیکن اس سفر کے دوران پورے ہندوستان میں "مسلم کُش فساد" تو درکنار کسی مسلمان کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ چنانچہ وہ لوگ پورے امن و ضبط کے ساتھ

گئے' اپنا کام پورا کیا اور اسی امن اور نظم و ضبط کے ساتھ گھروں کو لوٹ گئے ---- چھ ہزار کے لگ بھگ مسلمان بعد میں اس وقت ہلاک ہوئے جب انہوں نے "احتجاجی" تحریک میں توڑ پھوڑ کی اور پولیس نے انہیں بھون کر رکھ دیا---- اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی نگاہ رہے کہ اس جماعت نے اس قدر قوت و وسعت کے باوجود ملکی انتخابات میں کبھی براہ راست حصہ نہیں لیا۔ بلکہ پہلے ۱۹۵۱ء میں "جن سنگھ" کو اپنا پولٹیکل فرنٹ قرار دیا۔ اور پھر ۱۹۸۰ء سے "بی جے پی" یہ رول ادا کر رہی ہے' جس کے نہایت عسکری بازو (MILITANT WINGS) وشوا ہندو پریشد (V.H.P) اور رشیو سینا ہیں! گویا معاملہ اس اعتبار سے بھی کانگرس کے برعکس ہوا۔ یعنی کانگریس نے جب تحریک چلائی تو دستور کو تہہ کر کے رکھ دیا اور "آمریت" اختیار کر لی' اور آر ایس ایس نے سیاست میں حصہ لیا تو "گوروؤں" والے نظام سے بالکل علیحدہ دستوری اور جمہوری بساط بچھالی۔

اس کے برعکس حال ہمارا رہا کہ جماعت اسلامی نے سیاست میں حصہ لینا چاہا تو بھی اپنی کڑی "شرائط رکنیت" کو برقرار رکھتے ہوئے' اور انتخابات میں حصہ لینا چاہا تو بھی ابتداءً امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کو حرام قرار دیتے ہوئے ---- چنانچہ نہایت مایوس کن صورتحال سے سابقہ پیش آیا۔ اور پھر اس کے بعد سے آج تک "تنزل" کے ضمن میں مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے کہ ادھر جماعت اپنے معیارات کو ایک قدم نیچے لاتی ہے تو ادھر معاشرہ اخلاقی اعتبار سے دو قدم اور نیچے اتر جاتا ہے اور جماعت کے ہاتھ میں ہر بار بھاگتے چور کی لنگوٹی تک نہیں آپاتی ---- دوسری طرف نومولود "تحریک اسلامی" ہے جو تاحال "امارت" اور "شورائیت" کی بحثوں میں غلطاں و پیچاں ہے!---- کاش کہ جماعت اور تحریک' دونوں کے اصحابِ فکر و نظر اور اربابِ حل و عقد ہماری ان گزارشات پر غور کر سکیں---!

پھر ان میں سے بھی جہاں تک جماعت اسلامی کی "قیادت" کا تعلق ہے' وہ تو چونکہ بہت اونچی ہواؤں میں اڑنے کی عادی ہے' لہٰذا اس تک تو شاید ہماری یہ گزارشات پہنچ بھی نہ پائیں---- البتہ تحریک اسلامی چونکہ ابھی ہماری ہی طرح "خاک نشین" ہے' لہٰذا بعید نہیں کہ اس کے ذمہ دار حضرات ان گزارشات پر غور گوارا کر لیں کہ:

○ اگر تو "عظیم تر" تحریک اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے یا خارج کئے جانے والے بعض دوسرے حضرات کے مانند اب جناب نعیم صدیقی صاحب سے علیحدہ ہونے والے احباب کا اصل مطمح نظر بھی صرف دعوتی و تبلیغی یا علمی و تعلیمی یا رفاہی و اصلاحی ہے'

○ یا ان کے پیش نظر بھی اصلاً ملکی سیاست ہی کے اکھاڑے میں اترنا ہے' خواہ براہ راست خود انتخابات میں حصہ لے کر خواہ کسی سیاسی دھڑے کو تقویت پہنچا کر تب تو دستوری و جمہوری نظام ہی درست ہے' اور اس کے ضمن میں جس طرح انہوں نے جماعت میں شمولیت کی شرائط میں نرمی کردی ہے (چنانچہ اب ایسے حضرات بھی اس کے رکن ہی نہیں شوریٰ تک میں شامل ہیں جو اپنے کاروبار کے ضمن میں بینک سے سودی قرضے لینے اور انکم ٹیکس کے ضمن میں اخفاء یا غلط بیانی پر مجبور ہیں' بنابریں اس سے قبل جماعت اسلامی کی رکنیت حاصل نہیں کرسکتے تھے) اسی طرح اختلاف رائے اور اس کے اظہار ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی رائے کو تقویت پہنچانے کے لئے اعلانیہ اور انفرادی سطح پر یا گروپوں کی صورت میں گفتگوؤں' اور پھر باضابطہ انتخابات میں اپنے ہم خیال لوگوں کے لئے رائے ہموار کرنے کی کوششوں کے ضمن میں بھی اپنے سابقہ معیارات میں نرمی اور تخفیف پیدا کیجئے۔

○ اور اگر اصل ہدف "اقامتِ دین" کے لئے وہ انقلابی جدوجہد ہے جس کے ابتدائی مراحل کا نقشہ مولانا مودودی مرحوم نے ۱۹۴۰ء میں "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے!" نامی خطاب میں پیش کیا تھا اور جس کے آخری مراحل میں لازماً شدید تصادم اور ٹکراؤ اور جان کی بازی لگانا ناگزیر ہوگا تو اس صورت میں ابھی سے "بیعتِ شخصی" ہی کے خالص دینی نظام کو اختیار کرلیجئے تاکہ نفوس ابھی سے "فِی العُسرِ وَالیُسرِ وَالمَنشطِ وَالمَکرہ وعلٰی اثرۃٍ"---- "سمع وطاعت فی المعروف" کے ضمن میں ایثارِ ذات اور ایثارِ رائے کے عادی اور خوگر ہوجائیں---- اس ضمن میں قابل غور بات یہ ہے کہ کیا آپ کے پاس کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کے خلوص و اخلاص اور اصابتِ رائے پر اتنا اعتماد کیا جاسکے کہ ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں اور وہ جملہ

ساتھیوں کے بہترین مشوروں سے استفادہ کرتے ہوئے اطمینان کے ساتھ جماعت کے کام کو آگے بڑھا سکے!

دوسری جانب جناب نعیم صدیقی صاحب کا ساتھ دینے والے احباب اب اگر امیر کے ہاتھ میں فیصلہ کن اختیار دینے کے حق میں ہیں تو ان سے گزارش ہے کہ پھر سیدھے اور سادے طریقے پر ان کے ہاتھ پر "بیعت" ہی کر لیں۔ اس لئے کہ اگر امیر جماعت شوریٰ کی اکثریت کی رائے کو ویٹو کر دینے کا مجاز ہو (جیسا کہ مولانا مودودی مرحوم کا خیال تھا) تو خواہ مخواہ لمبے چوڑے دستوری کھکھیڑ میں پڑنے کی آخر کیا ضرورت ہے' جبکہ حیدر آباد دکن کے مولانا محمد یونس کی مرتب کردہ کتاب "خطوط کے چراغ" میں مولانا مودودی مرحوم کا جو خط مارچ ۱۹۴۱ء کا شامل ہے' اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کا اپنا ذہن واضح طور پر شخصی بیعت کے منصوص' مسنون اور ماثور طریقے ہی کی جانب زیادہ رجحان رکھتا تھا۔ (مولانا مرحوم کا یہ خط اسی شمارے کے صفحہ ۲۰ پر دیکھا جا سکتا ہے!)

اور آخری گزارش یہ کہ بیعت خواہ شخصی ہو یا دستوری' دونوں ہی صورتوں میں اگر انتخابات میں حصہ لینے کے ضمن میں میری مولانا مودودی مرحوم ہی کی ۴۵ء کی تحریر پر مبنی اس تجویز کو قبول کر لیا جائے جو میں نے اگست ۹۵ء کی تقریر میں پیش کی تھی اور "میثاق" کے اکتوبر ۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی تو میں اپنی تنظیم کی جانب سے آپ کے دونوں دھڑوں کے ساتھ "وفاق" کی صورت اختیار کرنے کے لئے تیار ہوں---- تاکہ تقسیم در تقسیم اور تفرقہ و انتشار کا عمل کہیں تو رک کر ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!" کے مصداق "توفیق و وفاق" اور "توحید و اتحاد" کی جانب رخ کر سکے---- وما علینا الا البلاغ!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مکتوب گرامی مولانا مودودی مرحوم و مغفور

بنام مولانا محمد یونس، حیدر آباد دکن، مارچ ۱۹۴۱ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں :

(۱) وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہو۔ جیسے بیعت الرضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہل مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ پیش آمدہ مہم میں آپؐ کے ساتھ جانفروشی کریں گے۔

(۲) دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت ہے جو بالعموم ہر شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام خداوند تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبیؐ کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبیؐ کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقہ نبویؐ کا صحیح علم بھی رکھتا ہو، اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

(۳) تیسری بیعت وہ ہے جو جماعت اسلامی کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور رسولؐ کا مطیع ہے اس وقت تک جماعت اسلامی کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔

مَن ماتَ ولیس فی عُنقِہ بیعۃٌ مات میتۃً جاھلیۃً

اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں بیعت سے مراد تیسری بیعت ہے، کیونکہ اس پر جماعت اسلامی کی زندگی اور اس کے نظم کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امر عظیم کا بار امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

خالص دینی جماعت سے علیحدگی

گزشتہ دنوں تنظیم اسلامی کے ایک اہم اور بزرگ رفیق نے بعض معاملات سے بددلی کے باعث تنظیم سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اس پر جو مختصر خط و کتابت ان کے اور امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مابین ہوئی اس میں امیر تنظیم کے قلم سے چند ایسے جملے صادر ہوئے جن کو مستقلاً محفوظ رکھنا نہایت مفید ہوگا۔ چنانچہ انہیں ذیل میں شائع کیا جارہا ہے ---- الحمدللہ کہ اس خط و کتابت کے نتیجے میں متعلقہ رفیق نے فوراً ہی دوبارہ تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی! (ناظم اعلیٰ' تنظیم اسلامی پاکستان)

مکتوب نمبر ۱

"آپ کے استعفاء کی اطلاع کل صبح ہی فون پر مل گئی تھی۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ میرے لئے تو یہ برادرم اقتدار احمد مرحوم کے سانحۂ ارتحال سے ہرگز کم افسوسناک اور غم انگیز حادثہ نہیں ہے'

تاہم -- بمصداق: "مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ" (التغابن) اور "لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ" (الحدید)

صبر کے سوا چارہ نہیں ہے

فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ!

تنظیم اسلامی میں شمولیت اور علیحدگی کا معاملہ چونکہ عام سیاسی جماعتوں یا سماجی تنظیموں سے بالکل مختلف 'ایک خالص دینی "معاملے" یعنی "بیعت" سے منسلک ہے' لہٰذا: پہلے بھی واقعہ یہ ہے کہ میں نے اسے آپ کا بہت بڑا ایثار سمجھا تھا کہ آپ مجھ سے "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" کے مقدس رشتے میں منسلک ہوئے ---- درآنحالیکہ

میرے دل نے ہمیشہ یہ گواہی دی' اور میں برملا اعتراف بھی کرتا رہا (اور مجھے امید واثق ہے کہ آپ نے بھی اس میں ہرگز کسی تکلف یا تصنّع کا شائبہ نہیں محسوس کیا ہوگا) کہ تقویٰ اور تدیّن میں آپ مجھ سے بہت آگے ہیں۔

اور اب بھی میں آپ سے یہ درخواست نہیں کر سکتا کہ آپ لازماً میری "بیعت" کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے رکھیں'

اس لئے کہ یہ کلیتہً آپ کے ایمان اور ضمیر کا معاملہ ہے اور اس میں کسی دوسرے کے کچھ کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

بالخصوص میں تو کچھ بھی عرض نہیں کر سکتا!

البتہ اس خالص دینی معاملے کے ایک اہم پہلو کے بارے میں خالصتاً "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" کے فرمانِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا حق ادا کرنے کے لئے یہ وضاحت کر رہا ہوں کہ : اس قسم کی "بیعت" سے "رجعت"--- جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں (واللہ اعلم!) صرف حسب ذیل تین صورتوں میں "جائز" ہے :

۱۔ یہ کہ امیر نے کتاب وسنّت کی حدود سے صریح تجاوز کیا ہو اور اس پر مصر بھی ہو۔ [اگرچہ اس معاملے میں حدیثِ نبویؐ کے یہ الفاظ کہ : "اِلَّآ اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ فِیْہِ مِنَ اللّٰہِ بُرْھَان" (صحیح مسلمؒ) پیش نظر رکھنے ضروری ہیں!]

۲۔ یہ کہ بیعت کرنے والے کو امیر کی نیت میں کسی قسم کے فتور کا حتمی شائبہ نظر آنے لگے!

۳۔ یہ کہ یہ محسوس ہو کہ طریق کار بحیثیتِ مجموعی اب کسی غلط سمت میں مڑ گیا ہے' یا پہلے ہی سے غلط تھا لیکن بیعت کرنے والے کو اس کا ادراک یا شعور نہ ہو سکا تھا۔ (اس ضمن میں بھی لازم ہے کہ امکانی حد تک افہام و تفہیم کی سعی کے بعد مجبوراً علیحدگی اختیار کی جائے!)

ان تین کے سوا' کوئی بھی صورت میرے نزدیک "جائز" نہیں ہے اور میری ناچیز

رائے میں اس کے ضمن میں "فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ" (الفتح) کے عکس کا اندیشہ موجود ہے۔ واللہ اعلم!

اس کے ساتھ ایک درخواست بھی!

اور وہ یہ کہ اگر آپ کی علیحدگی کا سبب مندرجہ بالا تین اسباب میں سے ہے' تو میری خواہش ہے (بلکہ میں یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ یہ میرا "حق" ہے) کہ آپ مجھے اس سے "مطلع" ضرور فرمادیں۔ (اگرچہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں میں ہرگز نہ خود کسی بحث و تمحیص میں الجھوں گا نہ آپ کو الجھانے کی کوشش کروں گا۔ بلکہ ان شاء اللہ العزیز' حتی الامکان اپنے معاملے ہی پر ناقدانہ نگاہِ بازگشت ڈالوں گا---وَاللّٰہ علٰی ما اقول وَکیل!)

لیکن اگر آپ کی علیحدگی کا اصل سبب ان تین کے علاوہ ہے تو پھر یہ آپ کے اور اللہ کے مابین معاملہ ہے' اور اس کی جوابدہی اللہ کے یہاں آپ ہی کو کرنی ہوگی۔

میں صرف اس قدر ضرور عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ :

میں نے اپنے مقدور بھر آپ کی عمر' مرتبے' اور تقویٰ کے متناسب ادب و لحاظ میں جان بوجھ کر کبھی کوئی کمی نہیں کی۔ اگرچہ ذمہ داریوں کی تفویض میں آپ کی عمر' صحت اور آپ کی دوسری مصروفیات کو ضرور ملحوظ رکھا ہے۔

تاہم بفحوائے : "وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ" کے تحت عین ممکن ہے کہ مجھ سے کبھی کوئی تقصیر ہوئی ہو۔

لیکن اس کے ضمن میں بھی دو باتیں سامنے رہنی چاہئیں :

۱۔ یہ کہ امورِ بیعت میں سے ایک "وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیَّ" بھی تھا۔ اور

۲۔ یہ کہ متعدد احادیث میں یہ ہدایتِ عمومی وارد ہوئی ہے کہ : تم اپنے امراء کی زیادتیوں پر صبر کرتے ہوئے' ان کے حقوق ادا کرتے رہنا اور اپنے صبر کے لئے اللہ سے اجر کی توقع رکھنا!" (روایت بالمعنیٰ)

مکتوب نمبر۲

"آگے بڑھنے سے پہلے آپ کے تین "شکریئے" مجھ پر واجب ہیں' ان کو ادا کرلوں :

شکریہ نمبر۱ اس کا کہ آپ ملاقات کے لئے تشریف لائے!

شکریہ نمبر۲ اس کا کہ آپ نے مجھ سے بھی فرمایا---(اور چند دوسرے احباب سے بھی یہی کہا) کہ آپ کی علیحدگی کا سبب ان تین اسباب میں سے کوئی بھی نہیں ہے جنہیں میں نے اپنی تحریر میں درج کیا ہے۔ فَلِلّٰہُ الحَمدُ وَلکم الشُّکر!

شکریہ نمبر۳ اس کا کہ آپ "اسلام میں تنظیم کی اہمیت' نوعیت اور اساس" کے موضوع پر میری تقریر کا ویڈیو دیکھنے کے لئے تشریف لے آئے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ان تمام معاملات پر بھرپور اجر و ثواب عطا فرمائے' آمین!

میں نے جملہ رفقاء و احباب کو ہدایت کردی ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی افواہوں پر دھیان نہ دیں۔ اور نہ ہی آپ کو زیادہ پریشان کریں۔ تنظیم اسلامی میں شمولیت کی اساس "بیعت" ہے اور وہ ایک "سہ فریقی" (Tripartite) معاملہ ہے' بیعت کرنے والے' اور جس سے بیعت کی جائے' اور اللہ کے مابین!!--- کسی تیسرے "انسان" کو اس میں کوئی دخل حاصل نہیں ہے۔!

آئندہ کے لئے دو گزارشات پیش خدمت ہیں :

ایک یہ کہ منفی اعتبار سے ان تین امور پر مزید غور جاری رکھئے جن کی بنا پر میری رائے میں اقامتِ دین کے لئے قائم ہونے والی کسی جماعت سے (اور وہ بھی بیعت کی مسنون بنیاد پر!) علیحدگی درست ہے-----

لیکن اس کے ساتھ حسب ذیل امور پر بھی مثبت انداز میں از سرِ نو غور فرمالیں :

میرے اب تک کے مطالعۂ قرآن و حدیث و سنّت و سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل یہ ہے کہ :

۱۔ ہر صاحبِ ایمان پر اقامتِ صلوٰۃ ہی کی طرح اقامتِ دین کی جدوجہد بھی فرض عین ہے۔

۲۔ اس کے لئے التزامِ جماعت بالکل اسی طرح کی شرط ہے جیسے نماز کے لئے وضو!!

۳۔ ایسی جماعت کے لئے اگرچہ دوسرے مروّجہ نظام بھی مباح کے درجہ میں ہیں لیکن واحد منصوص' مسنون اور ماثور اساس صرف "بیعتِ سمع وطاعۃ فی المعروف" کی ہے!

تنظیم اسلامی کے بارے میں اگرچہ آپ کی متعدد بار کی گواہی یہ رہی ہے کہ "اس کا ماحول خالص دینی ہے!" تاہم اگر آپ کو اس سے بہتر تنظیم یا جماعت نظر آگئی ہے' تو یہ یقیناً ایک چوتھا جائز سبب ہو سکتا ہے تنظیم اسلامی سے علیحدگی کا!

لیکن اس صورت میں حدیثِ نبوی ؐ ("لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ!") کے مصداق مجھے بھی اس پر لازماً مطلع فرمائیں!

مکتوب نمبر ۳

یہ عریضہ اس پیشگی وضاحت کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ میری جانب سے یہ آخری گزارش ہے۔ اس کے بعد میں مزید آپ کو پریشان نہیں کروں گا' اور گیند بالکلیہ آپ کے احاطے میں ہو گی!

مزید تمہید یہ کہ ---- تحریکوں' جماعتوں اور تنظیموں میں آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے' انبیاء کی جماعت میں سے بھی علیحدگی کی مثالیں موجود ہیں' تو تابہ دیگراں چہ رسد؟ (دین کی خدمت و اقامت کے لئے جو لوگ بھی کوئی جماعت قائم کرتے ہیں' ظاہر ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اس جماعت ہی کا مصداق بننے کی کوشش کرتے ہیں جس کے بارے میں حضرت معاویہ ؓ سے آنحضور ؐ کے یہ الفاظ مروی ہیں کہ "لَا تَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّةٌ قَائِمِیْنَ بِاَمْرِ اللّٰهِ" ---- اور اس جماعت کے لئے آپ ؐ کی صراحت ہے کہ: "لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ!" (بخاری ؒ و مسلم ؒ) ---- بنابریں میں نے تنظیم اسلامی کی ۲۰ سالہ تاریخ میں آج تک کسی بھی داغِ مفارقت دے جانے والے کا غیر ضروری

تعاقب نہیں کیا۔ آپ کی خدمت میں یہ تیسرا اور آخری عریضہ بھی صرف اس بنا پر تحریر کر رہا ہوں کہ مجھے آپ کے خلوص و اخلاص پر پورا اعتماد ہے۔

میرے اور آپ کے مابین جو بالواسطہ گفتگو اب تک ہوئی ہے' اس کے دو پہلو ابھر کر سامنے آئے ہیں' جن میں سے ایک کو منفی قرار دیا جا سکتا ہے اور دوسرے کو مثبت:

منفی پہلو ---- جن متعدد امور پر مشتمل ہے ان سب کا لبِّ لباب یا حاصلِ جمع میری "نااہلی" قرار پاتی ہے --- اس لئے کہ (i) اگر تحریک میں نظری انقلابیت کے باوجود عملی انقلابیت کا فقدان ہے تو اس کا اصل ذمہ دار بھی میں ہوں (ii) اس طرح اگر میں نے تنظیمی ذمہ داریوں اور مناصب کی تقسیم میں صحیح فیصلے نہیں کئے تو یہ بھی یقیناً میری نا سمجھی ہے ---- وَقِسْ علیٰ ذٰلک!

میں اپنی ان جملہ نااہلیوں کو صرف قرینِ قیاس و امکان ہی نہیں' لائقِ وثوق و یقین سمجھتا ہوں --- تاہم ان کے ضمن میں دو امور کی جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں:

ایک یہ کہ اہلیت اور نااہلیت کا بنیادی تعلق دو ایسے امور سے ہے جو ہر انسان کے لئے GIVEN کے درجہ میں ہوتے ہیں' یعنی ایک پیدائشی GENES اور دوسرے ماحول' تعلیم' تربیت اور مواقع --- ان ہی دو سے ہر انسان کا "شاکلہ" تیار ہوتا ہے اور اس کی سعی و جہد اور دوڑ دھوپ اس کے اندر اندر ہی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں بھی "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" کا مضمون بار بار وارد ہوا ہے۔ اور اس حقیقت کی جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رہنمائی فرمائی ہے کہ: "اِعْمَلُوْا فکلٌّکم میسَّرٌ لِما خُلِقَ" ---- بہرحال میں اپنے بارے میں ہرگز نہ آج کسی مغالطے میں مبتلا ہوں نہ جولائی ۱۹۷۴ء میں تھا جب میں نے تنظیم کے قیام کے لئے اپنے "عزم" کا اعلان کیا تھا لیکن ایک فرض کا احساس تھا جس نے اُس وقت بھی ع "دل اگندیم بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرِیھَا وَمُرْسٰھَا" پر آمادہ کر دیا تھا -- اور وہی اب بھی اپنی بساط و استعداد کے مطابق کام کئے جانے پر مجبور کئے ہوئے ہے! (ملاحظہ ہو تنظیم کا کتابچہ

نمبر۱ بعنوان "عزم تنظیم!")

دوسرے یہ کہ افراد کی صلاحیتوں کے "کسر" کا "جبر" اجتماعیت ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے' یعنی یہ کہ مل جل کر باہمی تنقید و مشورے کے ساتھ' ایک ٹیم ورک کی سپرٹ سے ایک دوسرے کے "کسر" کا "جبر" کرتے ہوئے آگے بڑھیں--- اور اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ "لڑتے جھگڑتے" ہوئے بھی ساتھ چلتے رہنا اس سے بہتر ہے کہ علیحدگی اختیار کر کے اجتماعی مقصد کو نقصان پہنچایا جائے۔ (اِلّا یہ کہ ان چار باتوں میں سے کوئی واقع ہو جائے جن کا پچھلے خطوط میں تذکرہ ہو چکا ہے!)

اس ضمن میں' معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ' میرے نزدیک آپ نے شدید "عدم توازن" کی روش اختیار کی۔ کہ میرے "لحاظ" اور "ادب" یا "حجاب" کے باعث وضاحت کے ساتھ بات نہیں کی اور اسے میں آپ کے خلوص و اخلاص کے پیش نظر صرف "عدم توازن" قرار دے رہا ہوں ورنہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ اس سے زیادہ قابلِ اعتراض بات ہے' اس لئے کہ "بیعت" کے امور میں صراحت کے ساتھ "وَعَلٰی اَنْ اَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنْتُ لَا اَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ" کے الفاظ موجود ہیں۔ مزید برآں یہ کسی بھی اجتماعیت کے مسلّمہ اصولوں میں سے ہے کہ نہ صرف اظہارِ اختلاف بلکہ "اتمامِ حجت" کے بعد ہی علیحدگی اختیار کی جائے!

بہرحال اب بھی' آپ خواہ تنظیم میں واپس تشریف لائیں یا نہ لائیں' میرا یہ حق آپ کے ذمہ واجب الادا ہے' اور اس کی ادائیگی آپ کی ذمہ داری ہے' اور میری یہ گیند مستقلاً آپ کے احاطے میں رہے گی!

مثبت پہلو کے ضمن میں اللہ کا شکر ہے کہ آپ نے تیسری بار بھی اعتراف کر لیا کہ آپ کی علیحدگی میں نہ ان تین عوامل کو دخل حاصل ہے جن کا ذکر میں نے اپنے پہلے عریضے میں کیا تھا' نہ اس چوتھے کو جس کا ذکر دوسرے عریضے میں بر سبیلِ تذکرہ آ گیا تھا۔

البتہ آپ کی جو ایک بات سامنے آئی ہے اس کے ضمن میں ضرور کچھ عرض کرنا

چاہتا ہوں :

یہ بات صدفی صد درست ہے کہ آخرت کا محاسبہ بالکلیہ اور خالصتاً انفرادی ہے لیکن اس کے حوالے سے اجتماعی فرائض سے گریز ہرگز درست نہیں بلکہ وسوسۂ شیطانی کے قبیل کی شے ہے!

جس طرح "اقامت الصلوٰۃ" کے ضمن میں مَردوں کے لئے "التزامِ جماعت" لازم ہے (الّا یہ کہ کوئی عذرِ شرعی مانع ہو!) چنانچہ "لَا صَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ" (الحدیث) تک کی تنبیہ موجود ہے۔

اسی طرح "اقامتِ دین" کے لئے بھی "التزامِ جماعت" شرط ہے۔ بلکہ نماز تو تنہا پڑھ کر بھی کسی درجہ میں "ادا" تو ہو جاتی ہے---اقامتِ دین کی جدوجہد کا تو انفرادی طور پر کوئی امکان ہی موجود نہیں!

ہاں یہ بات ختم نبوت کے بعد کسی بھی معیّن جماعت کے لئے حتمی اور یقینی نہیں ہے!--- تاہم اگر کسی شخص کا موجود الوقت کسی بھی جماعت پر دل نہ ٹھکے---تو اس کے لئے لازم ہو گا کہ خود کھڑا ہو اور لوگوں کو اپنا ساتھ دینے کی دعوت دے۔

چنانچہ جس طرح ایک امام اور ایک مقتدی کے ساتھ بھی جماعت ہو جاتی ہے' اسی طرح ایک "امیر" اور ایک "مامور" سے بھی یہ تقاضا پورا ہو جائے گا۔ اس میں میرے علم و فہم کی حد تک واحد استثناء اس صورت میں ہے کہ فتنہ اتنا شدید اور گھمبیر ہو جائے کہ انسان کی سمجھ میں ہی نہ آ سکے کہ ع "کس طرف جاؤں' کدھر دیکھوں' کسے آواز دوں!"--- لیکن اس صورت میں آبادیوں سے نکل کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا کر درختوں اور پودوں کی جڑوں سے پیٹ بھرنے کا حکم احادیثِ نبویہؐ میں وارد ہوا ہے۔

فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا !

- ڈاکٹر محبوب الحق: حق کے محبوب یا صیہونیت کے ایجنٹ؟
- نام نہاد انتخابی اصلاحات یا نظریۂ پاکستان کی حتمی نفی؟
- پاکستان : ایشیائی اتحاد کا مرکزی ستون یا نئے یہودی عالمی مالیاتی استعمار کا بے دام غلام؟ اور
- امریکہ میں انگریزی دورۂ ترجمہ قرآن اور نیویارک میں "انسٹیٹیوٹ آف قرآنک وِزڈم" کا قیام

حالیہ سفرِ امریکہ سے واپسی پر ۸/ مارچ کو مسجد دار السلام لاہور میں
امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب

خطبۂ مسنونہ' سورۃ الاعراف کی آیات ۷۵'۷۶'۷۷ کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا :

حضرات! گزشتہ چھ جمعوں کی غیر حاضری کے بعد آج ملاقات ہو رہی ہے۔ ان میں سے تین جمعے میں نے تسلسل کے ساتھ مسلم سنٹر آف نیویارک میں پڑھائے' جو نیویارک میں کوئینز کے علاقے میں واقع آبادی فلشنگ کے اندر قائم ہے۔ یہ سنٹر وہاں بڑے عرصے سے قائم ہے' لیکن حال ہی میں اس کی بڑی عمدہ اور خوبصورت چار منزلہ عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ نیویارک سے متصل ہی لانگ آئی لینڈ کا علاقہ ہے' جس میں ایک جمعہ بے شور (Bay Shore) کی بستی کے اندر مسجد دار القرآن میں ادا ہوا۔ ایک جمعہ مین ہیٹن' جو گویا کہ امریکہ کا قلب ہے' اس میں قائم مسجد الرحمٰن میں پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی' جبکہ

میرے قیام کا آخری جمعہ ساؤتھ نیو جرسی کے علاقے میں مسجد الصفا (ٹرینٹن) میں ادا ہوا۔ چنانچہ اس مرتبہ میں نے پورے چالیس دن وہاں بسر کئے ہیں' لیکن میرا امریکہ کا یہ چلہ "چلۂ قرآن" تھا۔ اس میں نہ تو میرا کوئی ذاتی سفر ہوا' نہ ہی اخبارات سے سرے سے کوئی رابطہ رہا' نہ کبھی ٹیلی ویژن ہی دیکھنے کا موقع ملا۔ گویا میں دنیا سے تقریباً منقطع رہا۔ اگرچہ وہاں پر کبھی کبھی پاکستان کے اخبارات کی کوئی شکل بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے' لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ یہ چلہ درحقیقت دورۂ قرآن یعنی انگریزی زبان میں دورۂ ترجمہ قرآن کے لئے وقف تھا۔

امریکہ میں دورۂ ترجمہ قرآن' بزبان انگریزی

آپ کو یاد ہو گا کہ میں پچھلے سال رمضان المبارک میں وہاں اسی ارادے سے گیا تھا' اس لئے کہ وہاں کے احباب کا بڑا شدید تقاضا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو میں تو آپ کا دورۂ ترجمہ قرآن ریکارڈ شدہ ہے اور یہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹس میں دستیاب ہے' بلکہ اس کے کئی کئی "sets" موجود ہیں' لیکن اگر یہی کام انگریزی میں بھی ہو جائے تو یہ ہماری وہاں کی شدید ضرورت ہے۔ لیکن پچھلی مرتبہ یہ کام اللہ کو منظور نہ تھا۔ میں رمضان المبارک سے قبل وہاں گیا اور اپنے گھٹنوں کا چھوٹا آپریشن کرایا۔ مجھے یہ توقع دلائی گئی تھی کہ تین چار دن کے اندر اندر آپ اپنی معمول کی سرگرمیاں شروع کر سکیں گے۔ لیکن جب میں نے دورۂ ترجمہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ بات محض خام خیالی تھی۔ لہٰذا جب گھٹنوں کے ساتھ ساتھ پورے پاؤں اور پنڈلیوں پر سوجن بہت زیادہ ہو گئی تو مجھے وہ سلسلہ چھوڑنا پڑا۔

اس مرتبہ اللہ کا شکر ہے کہ اگرچہ میرا وہاں پہنچنا تاخیر سے ہوا تھا' لیکن دورۂ ترجمہ کا کام بحسن وخوبی ہوا۔ اور مسلم سنٹر آف نیویارک کی نئی تعمیر شدہ عمارت کا افتتاح ہی گویا کہ دورۂ ترجمہ قرآن سے ہوا۔ بلکہ وہاں کے قوانین کے مطابق ابھی اس کا "قرطاسِ تصرف" (Occupancy Certificate) حاصل نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس کے لئے انتہائی دوڑ دھوپ بھی کی گئی' لیکن پھر وہاں کے رفقاء نے یہ فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو' ہم اس کو شروع کر دیں گے۔ لہٰذا وہاں دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز ہو گیا۔ میرے لئے انگریزی میں

دورۂ ترجمہ قرآن اتنی تفصیل اور روانی کے ساتھ ممکن نہیں تھا جس طرح میرا اردو میں دورۂ ترجمہ قرآن ہوتا ہے' اس لئے اس کا نصاب بھی کم رہا اور روزانہ تقریباً آدھا پارہ یا عرف عام کے مطابق اڑھائی پاؤ کی اوسط کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن جاری رہا۔ پچھلے سال مجھے جو چند دن ملے تھے اس میں سورۃ البقرہ اور سورہ آل عمران کا انگریزی ترجمہ مختصر تشریحات کے ساتھ ریکارڈ ہو گیا تھا اور اس کے آڈیو اور ویڈیو تیار ہو گئے تھے۔ اس بار مسلم سنٹر آف نیویارک میں تقریباً سترہ دنوں میں سورۃ النساء سے سورۃ الحجر تک (ساڑھے نو پارے کے لگ بھگ) کی تکمیل ہو گئی۔ آخری عشرے کا وعدہ میں Bay Shore کی مسجد دارالقرآن کا کر چکا تھا' جہاں میں نے انتیسویں اور تیسویں پارے کی تکمیل کی ہے۔ اور اس کے بھی علیحدہ سے آڈیو ویڈیو تیار ہو گئے ہیں۔ گویا کہ اب تک وہاں پر نصف قرآن سے قدرے زائد یعنی سوا پندرہ پارے کا دورۂ ترجمہ قرآن انگریزی میں ریکارڈ ہو گیا ہے۔ اور بقیہ نصف کے لئے ان دونوں مسجدوں سے بڑی پرزور تاکید ہے کہ 'بشرطِ زندگی اور صحت اور حالات کے موافق ہونے کی شرط کے ساتھ' آپ ہماری ہی مسجد میں بقیہ دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کریں۔ اب یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ آئندہ سال کیا ہو گا۔ بہرحال میرا یہ پورا مہینہ بلکہ پورا چلہ "اعتکاف بالقرآن" میں گزرا ہے۔ اس میں سے خاص طور پر میرے جو سترہ اٹھارہ دن مسلم سنٹر آف نیویارک کی مسجد میں گزرے ہیں ان میں تو فی الواقع اعتکاف کی کیفیت تھی' اس لئے کہ سیکنڈ فلور پر مسجد تھی اور اس کے ساتھ ہی اسی فلور پر ان کا ایک فلیٹ تھا جس میں میری رہائش تھی' اور مجھے مسجد میں آنے جانے کے لئے جوتے اتارنے یا پہننے بھی نہیں پڑتے تھے' بلکہ اس فلیٹ کا دروازہ گویا مسجد ہی میں کھلتا تھا۔ میں سترہ دن تک وہاں سے نیچے اترا ہی نہیں۔ اس پورے چلے کے دوران قرآن کے ساتھ میرا جو اعتکاف رہا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔

امریکی سیاست کا ایک قابل ذکر پہلو

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس دوران اخبارات سے کوئی رابطہ رہا نہ ٹیلی ویژن سے' نہ ہی وہاں کی سماجی سرگرمیوں سے کوئی تعلق رہا اور نہ میں نے کہیں اور کا سفر کیا۔ لہٰذا اس

مرتبہ میں امریکہ کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی حالات اور اس وقت وہاں پر جو تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ گزشتہ مرتبہ جب میں حاضر ہوا تھا تو میں نے اس موضوع پر مفصل خطاب کیا تھا' لیکن اس مرتبہ میں اس موضوع پر اظہار خیال نہیں کر رہا' سوائے اس کے کہ ایک نئی بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ امریکہ کے آئندہ ہونے والے صدارتی انتخابات کے لئے ری پبلیکن (Republican) پارٹی کی طرف سے نامزد کردہ ایک امیدوار Buchanan بھی ہے اور یہ گویا اسی طرز فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں جو یہودیوں کے بھی خلاف ہے اور تارکین وطن کے بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں امریکہ کو امریکہ بنانا چاہئے' خواہ مخواہ پوری دنیا کا درد سر اپنے سر نہیں لینا چاہئے اور یہ کہ امریکہ کو اصل توجہ اپنے داخلی اور قومی و ملکی مسائل پر مرکوز کرنی چاہئے۔ اور اسے پوری دنیا کا پولیس مین بننے اور پوری دنیا کے لئے ایک نیو ورلڈ آرڈر بنانے کا ٹھیکہ ڈمول نہیں لینا چاہئے۔ اس لئے کہ انہیں خوب معلوم ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر دراصل جیو ورلڈ آرڈر ہے۔ یہ بھی درحقیقت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے بارے میں میں نے پچھلی مرتبہ آکر ایک مفصل تقریر کی تھی' کہ امریکہ میں نئے رجحانات اس رخ پر جا رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو میثاق نومبر و دسمبر ۱۹۹۵ء) یہی وجہ ہے کہ اب امریکہ کے پریس اور ٹیلی ویژن نے اس شخص کی کردار کشی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ جس طرح پال فنڈلے نے اپنی کتاب "They dare to speak" میں یہ ثابت کیا تھا کہ یہودیوں کے مفادات کے خلاف امریکہ میں جب بھی کسی نے زبان کھولی تو اس کی سیاسی زندگی ختم کر دی گئی اور اس کی سیاسی موت واقع ہو گئی' اس لئے کہ سارے ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کا قبضہ ہے' اسی طرح اب وہی عمل وہاں پر کے حوالے سے شروع ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے' یہ اللہ کو معلوم ہے۔

نیویارک میں "IQW" کا قیام

اس مرتبہ میں آپ حضرات کے لئے ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں۔ میں نے ابھی فلشنگ' نیویارک کے مسلم سنٹر کا ذکر کیا ہے۔ یہ مرکز وہاں پر بہت عرصے سے قائم ہے' اور

عجیب بات یہ ہے کہ ۱۹۷۹ء میں اپنے پہلے سفر امریکہ کے دوران بھی میں نے کچھ نمازیں اس مسجد میں ادا کی تھیں۔ انجمن خدام القرآن کے مؤسسین میں سے میاں رشید صاحب' جو اب خود بھی امریکہ منتقل ہو گئے ہیں' ان کے صاحبزادے فلشنگ میں مقیم تھے اور میں ان کے پاس ٹھہرا تھا۔ ان دنوں میں نے اس مسجد میں کچھ نمازیں بھی ادا کی تھیں اور کچھ تقاریر بھی کی تھیں۔ ۷۹ء کے بعد جب بھی میں امریکہ گیا ہوں تو چونکہ نیویارک ہی سے داخلہ ہوتا ہے اور وہیں سے روانگی ہوتی ہے اس لئے ہر مرتبہ میری آمد سے اس سنٹر کے ساتھ کچھ نہ کچھ ربط قائم رہتا ہے۔ یہ سنٹر پہلے تو ایک بہت چھوٹے سے فلیٹ میں تھا' پھر انہوں نے ایک پورا مکان لے کر اس میں سے کچھ دیواریں نکال کر ذرا بڑا مرکز بنایا۔ پھر دو تین مراحل طے کرنے کے بعد اب یہ امریکہ میں تعمیر کے جدید معیار کے عین مطابق ایک بہت بڑی چار منزلہ عمارت کی صورت میں تعمیر ہوا ہے۔ اس سنٹر کے ساتھ میرے مسلسل رابطے کا نتیجہ بحمداللہ یہ نکل رہا ہے کہ اس کے بارے میں اب اصولی طور پر یہ طے ہو گیا ہے کہ اس میں انسٹیٹیوٹ آف قرآنک وِزڈم (IQW) قائم کیا جائے گا' جو درحقیقت میری ہی سربراہی میں کام کرے گا۔ وہاں پر میری حیثیت پروفیسر امریطس (Professor Emeritus) کی ہو گی اور پھر میرا ہی کوئی شاگرد وہاں پر مستقل طور پر ہمہ وقت ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرے گا۔

آپ حضرات کے علم میں ہے کہ علم قرآن اور فہم قرآن کی بہت سی سطحیں ہیں جن میں اولین تو تذکر بالقرآن ہے۔ یعنی قرآن مجید کا سرسری مطالعہ اس انداز سے کرنا کہ اس سے انسان کو قرآن کا اصل پیغام حاصل ہو جائے' جس کے اعتبار سے قرآن حکیم نہایت آسان کتاب ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی : وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ "اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی یاد دہانی حاصل کرنے والا؟" دوسرا درجہ تدبرِ قرآن کا ہے' یعنی قرآن کی گہرائیوں کے اندر اترنا' اس کی حکمت' اس کے علوم و ہدایات اور اس کی معرفت سے حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ پھر تدبر کی بھی مختلف سطحیں اور درجات ہیں۔ ایک درجہ تو یہ ہے کہ سوشل سائنسز اور عمرانیات مثلاً پولٹیکل سائنس' نفسیات' معاشیات' تاریخ اور فلسفہ تاریخ

وغیرہ کے ضمن میں قرآن مجید کی ہدایت و راہنمائی کو اجاگر کیا جائے' کیونکہ آج کل عملی طور پر یہ مسائل زیادہ اہم ہیں۔ اور الحمدللہ اس سطح پر وہاں اس کام کا آغاز پہلے سے ہو چکا ہے۔ لیکن اس مرکز کے لئے میرے پیش نظر جو کام ہے وہ اس سے بلند تر سطح کا ہے اور اس سطح پر تاحال اگر کوئی کام ہوا ہے تو صرف پاک و ہند میں ہوا ہے۔ یہ علامہ اقبال کے خطبات "Reconstruction of Religious Thought in Islam" کی سطح ہے۔ یعنی مابعد الطبیعیات (Metaphysics) اور فلسفہ و تصوف اور شاعری کی اعلیٰ ترین فلسفیانہ سطح' جس کے لئے میں حکمت قرآنی (Quranic Wisdom) کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں۔ "حکمت" کی اصطلاح خود قرآن کریم کی اپنی اصطلاح ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت ۲۶۹) میں فرمایا گیا: یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَاءُ' وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا "اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت عطا فرما دی گئی اسے تو گویا کہ خیرِ کثیر عطا کر دیا گیا"۔ تو میرے نزدیک حکمتِ قرآنی کے حوالے سے اس وقت سب سے بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ فلسفے کی سطح پر' مابعد الطبیعیات کی سطح پر' اخلاقیات کی سطح پر' قرآن حکیم کی روشنی میں ان مسائل پر غور و خوض کیا جائے جن کا تعلق تصوف کی بلند تر سطح سے بھی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ہم نے پچھلے سال یہاں بھی "مسائلِ حکمت" کے عنوان سے ایک تربیت گاہ کا انعقاد کیا تھا۔ تو اسی طرح کا کام کرنے کے لئے ایک انسٹیٹیوٹ آف قرآنک ویزڈم ان شاء اللہ العزیز وہاں کام کرنا شروع کر دے گا جس کے ساتھ میرا مسلسل رابطہ رہے گا۔

میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں ہر سال ایک مہینہ انہیں دیا کروں گا۔ پھر یہ کہ ابتداءً تو یہاں سے ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب وہاں جائیں گے' لیکن پھر مستقل انتظام کے لئے بھی ہمارے پاس ایک آدمی الحمدللہ تیار ہو چکا ہے۔ یہ وہیں کے ایک نوجوان باسط بلال ہیں جنہوں نے یہاں آ کر ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس مکمل کیا ہے۔ انہوں نے پہلے پولٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور پھر Hartfort Seminary سے اسلامک سٹڈیز میں ایم اے کیا۔ اس جیسے اعلیٰ ترین سطح کے مشنری اداروں میں عیسائیوں کے زیر سایہ اسلامک سٹڈیز کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اصل فکر و فلسفے پر اور اپنے دین کی اصل

بنیادوں پر قائم رہنا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے جو ان پر اس شکل ہوا ہے۔ پھر ان کا رابطہ مجھ سے ہوا تو وہ یہاں آئے اور ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں وقت صرف کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ مزید علوم کی تحصیل کی۔ ابھی وہ یہیں ہیں' لیکن ان شاء اللہ وہ وہاں واپس جاکر ہمارے اس انسٹیٹیوٹ کے مستقل ڈائریکٹر ہوں گے۔

میں نے باسط بلال کا قدرے مفصل تعارف اس لئے بھی کرا دیا ہے کہ پاکستان سے واپس جانے سے قبل میں یہاں لاہور میں ان کا ایک پروگرام رکھوانا چاہ رہا ہوں۔ اور وہ اس بار ہمارے سالانہ "محاضرات قرآنی" میں لیکچر دیں گے۔ (یہ محاضرات قرآنی ان شاء اللہ ۱۹ تا ۲۱ اپریل کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ہوں گے!) ان کے لیکچرز کا عنوان ہو گا :

"Modern man on the verge of Post Modernism between Nietzsche and Iqbal"

مغرب میں جدیدیت کا نیا تصور

جیسا کہ میں نے عرض کیا مابعد الطبیعاتی سطح پر کام اولاً صرف علامہ اقبال نے کیا ہے۔ اور اقبال کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کیا ہے۔ علامہ اقبال کی طرح ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم بھی لاہور ہی میں مدفون ہیں۔ ان دو کے علاوہ اس سطح پر پورے عالم اسلام میں کسی شخص نے یہ کام نہیں کیا۔ ہمارے محاضرات میں جناب باسط بلال کی گفتگو اسی پہلو سے ہوگی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں جس چیز کو "Modernism" یا "Modernity" (جدیدیت) سمجھا جا رہا ہے اور ہمارے ہاں کے دانشور اور مغرب پرست لوگ خصوصاً خواتین کا طبقہ مغرب کی جس بھونڈے طریقے سے نقالی کر رہا ہے وہ چیز تو درحقیقت مغرب میں داستان پارینہ بن چکی ہے۔ فکر کی سطح پر اور اعلیٰ نظریاتی سطح پر مغرب میں ان چیزوں کو مسترد کیا جا چکا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ ان کی چچوڑی ہوئی ہڈیوں کو از سر نو چچوڑنے کی فکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جس کو یہاں کھل کر بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ تم کن سایوں کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ اہل مغرب تو ان چیزوں کو استعمال کرنے کے بعد اب ترک بھی کر چکے ہیں۔ وہاں وہ تصورات و نظریات اب مسترد ہو چکے ہیں جن کے بارے

میں ہم آج یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فکر انسانی کی معراج ہیں۔ اس اعتبار سے اس نوجوان کے لیکچرز کے لئے آپ اپنے آپ کو ذہناً تیار کیجئے اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں فلسفہ اور انگلش لٹریچر سے دلچسپی رکھنے والے دوست احباب کو بھی ان محاضرات میں شرکت کے لئے آمادہ کیجئے۔

قومی و ملکی حالات پر تبصرہ

اب آیئے اپنے ملکی حالات کی طرف۔ اُدھر تو میں آپ کے لئے یہ خوش خبری لے کر آیا ہوں اور اِدھر آ کر جو دیکھا تو نظر آیا کہ اس ڈیڑھ مہینے کے اندر صورتحال اور زیادہ گھمبیر ہوئی ہے۔ گویا ع "گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا" یعنی چینیوں نے تو احرام باندھ لئے ہیں اور مکے کے رہنے والے ابھی وادیٔ بطحا کے اندر سوئے ہوئے ہیں۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ امریکی تو اسلام کے لئے کام کرنے کو کمر کس رہے ہیں' لیکن پاکستان جو کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے وجود میں لایا گیا تھا اس کے رہنے والے صرف خواب غفلت میں سو ہی نہیں رہے بلکہ اس اعتبار سے تو ایک رجعت قہقری اور ایک ترقی معکوس ہو رہی ہے۔ ہم دن بدن اپنی "منزل مراد" سے پیچھے ہٹتے چلے جا رہے ہیں اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان سیکولرزم کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ بگٹٹ رواں دواں ہے۔ اس موضوع پر میں نے دسمبر ۱۹۹۲ء میں نوائے وقت میں دو کالم لکھے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ ایک ساتھی کے توجہ دلانے پر میں نے انہیں دوبارہ پڑھا تو میں خود حیران رہ گیا کہ میں یہ باتیں اتنے عرصے پہلے کہہ چکا ہوں۔ (یہ تحریر ۲۶ مارچ ۹۶ء کے ندائے خلافت میں دوبارہ شائع کر دی گئی ہے) اُس وقت میں نے کہا تھا کہ پاکستان سیکولرزم اور مسلم فنڈامینٹل ازم کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ لیکن یہ ساڑھے تین سال پہلے کی بات ہے اور اب وہ اس دوراہے سے بہت آگے نکل گیا ہے اور تیزی کے ساتھ سیکولرزم کی طرف بگٹٹ رواں دواں ہے۔

پاکستان-----دوراہے پر!

دوسرے یہ کہ پاکستان عالم اسلام کے اتحاد کے ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔ میں

نے بارہا بیان کیا ہے کہ عالم اسلام کے اتحاد کے سلسلے میں خاص طور پر ایران' افغانستان' پاکستان اور روسی ترکستان کی نو آزاد ریاستوں پر مشتمل ایک بلاک بنایا جائے۔ اور اس میں قائدانہ (leading) رول پاکستان ادا کرے۔ اور پھر یہ کہ ایشیا کی دو بڑی طاقتوں یعنی چین اور بھارت کے ساتھ اس مسلم بلاک کے کچھ قریبی دوستانہ روابط ہوں' ان کے مابین تجارتی تعلقات ہوں اور باہمی تعاون ہو۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارے لئے دوسرا راستہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ہم نئے عالمی مالیاتی یہودی استعمار کے بے دام غلام بن جائیں۔ ایک دوراہا تو میں نے اپنی اندرونی سیاست سے متعلق بیان کیا ہے جس پر ہم چار سال پہلے کھڑے تھے کہ آیا ہم اسلام کی طرف بڑھتے ہیں یا سیکولرازم کی طرف جاتے ہیں۔ اور آج ہم اس دوراہے سے بہت آگے سیکولرازم کی طرف نکل آئے ہیں۔ اب بھی اگر قوم میں یہ شعور پیدا ہو جائے اور یہ صحیح رخ پر قدم بڑھانے کے لئے تیار ہو جائے تو شاید بریک لگایا جا سکے۔ لیکن دوسرا دوراہا عالمی سطح پر ہے جس پر میں مفصل تقریریں کر چکا ہوں کہ ہمارے لئے اب دو رول ہیں اور ان میں سے ایک رول بڑی جرأتِ رندانہ اور ہمتِ مردانہ کا متقاضی ہے۔ یہ "لڑا دے ممولے کو شہباز سے" والی صورت حال کا متقاضی ہے اور وہ یہ ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے جو نیا عالمی مالیاتی یہودی استعمار آ رہا ہے ہم اس کا مقابلہ کرنے کی غرض سے ایک مسلم بلاک بنائیں۔ میں نے ایک خطاب میں عالم اسلام پر مغرب کی یلغار کے تین ادوار گنوائے تھے۔ ایک دور صلیبی جنگوں کا دور تھا جس کے اندر بے پناہ خون ریزی ہوئی اور ایک عرصے تک مسجد اقصیٰ اور یروشلم عیسائیوں کے قبضے میں رہا' لیکن مغربی اقوام یا عیسائی اقوام عالم اسلام پر مستقل قبضہ نہیں کر سکیں۔ یہ تو سمجھئے کہ ۱۰۰۰۔ ۱۱۰۰ء یعنی آج سے آٹھ نو سو سال قبل کی بات ہے۔ اس کے بعد آج سے چار پانچ سو سال قبل عالم اسلام پر براہ راست قبضہ کرنے کے لئے مغربی طاقتوں کا نو آبادیاتی (Colonial) استعمار شروع ہوا۔ چنانچہ کہیں ولندیزیوں نے اپنے پنجے گاڑ لئے تو کہیں فرانسیسیوں نے' کہیں پر اطالوی قابض ہو گئے اور کہیں پر برطانوی۔ اس نو آبادیاتی استعمار کا آغاز ہسپانیہ پر عیسائیوں کے قبضے کے بعد سے ہوا۔ ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ ہوا اور ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما نے راس امید کا چکر لگا کر راستہ تلاش کیا اور اس راستے سے پھر جو سیلاب مغرب کی

طرف سے شروع ہوا وہ اس صدی کے آغاز پر سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے پر منتج ہوا۔ اس طرح پورا عالم اسلام نو آبادیاتی طاقتوں کی گرفت کے اندر آ گیا۔ مقبوضہ ممالک میں آزادی کی تحریکیں چلیں تو اس براہ راست غلامی کی زنجیریں ٹوٹنی شروع ہوئیں۔ چنانچہ ہندوستان سے انگریز چلے گئے' الجزائر سے فرانسیسی چلے گئے' لیبیا سے اطالوی چلے گئے' انڈونیشیا سے ولندیزی چلے گئے' لیکن ابھی اس استعمار کی بساط پوری طرح تہہ نہیں ہوئی تھی کہ ایک نیا استعمار سر اٹھائے چلے آ رہا ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا!

یہ نیا استعمار "نیو ورلڈ آرڈر" کے عنوان سے آ رہا ہے' جس کا مقصد براہ راست قبضہ نہیں ہے' بلکہ یہ صرف مالیاتی استعمار ہے۔ یعنی ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ذریعے سے پوری دنیا کو معاشی شکنجے میں جکڑ لیا جائے اور ان کی تمام محنتوں کے اصل ثمرات حاصل کئے جائیں۔ میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ "نیو ورلڈ آرڈر" دراصل "جیو ورلڈ آرڈر" ہے اور یہود کے نزدیک تمام غیر یہودی جنٹائلز اور گوئمز ہیں' انسان نما حیوان ہیں۔ یہود کا فلسفہ یہ ہے کہ انہیں پوری نوعِ انسانی پر افضلیت حاصل ہے اور باقی پوری نوعِ انسانی کی حیثیت ان کے خدمت گاروں کی سی ہے' لہٰذا پوری دنیا کے انسانوں کی محنت کی کمائی یہود کو ملنی چاہئے۔ ان کو بس اتنا ملتا رہے کہ اگلے روز بھی محنت کرنے کے قابل ہوں' جیسے گھوڑے کو اگر اگلے روز بھی تانگے میں جوتنا ہو تو شام کو اسے کچھ نہ کچھ دانہ ڈالنا چاہئے اور کچھ گھاس کھلانا چاہئے تاکہ وہ اگلے روز کام کے قابل رہ سکے۔ اسی درجے میں بقیہ نوعِ انسانی کا اپنی محنت کی کمائی پر حق ہے۔ ورنہ اصل میں انسان تو صرف یہودی ہیں' باقی جو بھی ہیں یہ گوئمز ہیں' جنٹائلز ہیں' انسانوں کی شکل میں حیوان ہیں' ان کا استحصال کرنا ہمارا حق ہے' لہٰذا اس مالیاتی استعمار میں جکڑ کر ان کی ساری محنتوں کی ملائی اور مکھن ہم کھائیں اور اور چھاچھ وغیرہ کبھی ان کے حوالے بھی کر دیا کریں۔ یہ استعمار جو چلا آ رہا ہے اس کے راستے میں ایک مؤثر رکاوٹ صرف یہ مجوزہ مسلم بلاک بن سکتا ہے۔ اس لئے کہ عالم عرب تو اس کے آگے

سرنگوں ہی نہیں سربسجود ہو چکا ہے۔ اب تو یہی ایران' افغانستان' پاکستان اور روسی ترکستان ہیں جن کا ایک بلاک بنے اور پھر مشرق کے دو بڑے ممالک بھارت اور چین کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم ہوں۔ ایک رول تو یہ ہے جو ہم ادا کر سکتے ہیں۔

دوسرا متبادل رول یہ ہے کہ آپ اس استعمار کے آلہ کار بن جائیں' اس کے بے دام غلام بن جائیں۔ یہ "بے دام" کا لفظ میں خاص طور پر استعمال کر رہا ہوں' اس لئے کہ پہلے ہم غلامی کرتے تھے تو کچھ قیمت بھی وصول کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دنیا بائی پولر (Bi-Polar) تھی' جس میں ایک طرف روس (USSR) ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے موجود تھا اور دوسری طرف امریکہ اور اس کا بلاک تھا۔ تو ہمارے جیسے چھوٹے ملک اگر کسی کے ہاتھ بکتے بھی تھے تو اپنی قیمت وصول کر سکتے تھے۔ لیکن اب کس سے قیمت وصول کریں اور کس بنیاد پر کسی کو بلیک میل کریں؟ چنانچہ معلوم ہوا کہ اب تو بے دام غلامی ہے' جس کا سب سے بڑا مظہر حال ہی میں سامنے آیا ہے کہ پاکستان میں امریکہ کے سفیر صاحب نے کھل کر بیان دے دیا ہے کہ پاکستان نے اگر ہماری شرائط پر دوستی کرنی ہے تو کرے' ورنہ کوئی اور دوست تلاش کر لے۔ انہیں معلوم ہے کہ اور ہے کون؟۔ لہٰذا اسے چار و ناچار "اسی تنخواہ" پر کام کرنا پڑے گا۔ تو ہماری صورت حال تو واقعتاً یہ ہے کہ ہم ان کے بے دام غلام بن چکے ہیں اور ان کی پالیسیوں پر پورے طریقے سے عمل پیرا ہیں۔ اگر وہ کچھ عنایت کر دیں یا ان کی طرف سے کچھ چھوٹ ہو جائے تو یہ ان کا لطف و کرم ہے۔ چنانچہ کبھی کسی وقت ہمیں کوئی ترمیم کی خوشخبری سنا کر گویا "گاجر" دکھادی جاتی ہے اور کبھی ان کی طرف سے دھمکیاں آ جاتی ہیں۔ گویا ہم پوری طرح ان کی "کیرٹ اینڈ سٹک" (Carrot and Stick) پالیسی کے رحم و کرم پر ہیں اور ان کے بے دام غلام بن چکے ہیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق کی ہرزہ سرائی

دوسری طرف اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہوئی ہے کہ ورلڈ بینک کا ایک گماشتہ ڈاکٹر محبوب الحق اسلامیانِ ہند کی نصف صدی کی قومی جدوجہد کو بیک جنبشِ قلم منسوخ کرنے پر

اتر آیا ہے۔ پاکستان کا قیام اسلامیان ہند کی پچاس برس کی محنت اور جدوجہد کا ثمرہ تھا۔ اور اس جدوجہد میں بڑا حصہ بھارت کے مسلمانوں کا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تھی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا۔ اس طرح اسلامیانِ ہند کی جدّوجہدِ آزادی قریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ لیکن انہوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا کہ "میں تو سوچتا ہوں اور میرے بچے بھی یہ سوچتے ہیں کہ اب ان کو (پاکستان اور بھارت کو) ایک ہی ہو جانا چاہئے"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "میں جب جموں سے بھاگ کر گیا تھا....." میں تو ان کا یہ بیان پڑھ کر حیران ہوا اور میں سوچتا رہا کہ یہی کشمیر تھا جہاں سے علامہ اقبال کے آباء واجداد آئے تھے۔ پھر یہ جموں کے ہیں اور جموں ہی کے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم تھے' تو ایک ہی سرزمین سے کون کون پیدا ہوتا ہے۔ ایک ہی سرزمین سے ابوجہل بھی پیدا ہوتا ہے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان' تحریک پاکستان اور نظریہ پاکستان کی جس طور سے نفی کی ہے اس پر مجھے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ دراصل انہوں نے یہ باتیں "ورلڈ بینک" کے گماشتے کی حیثیت سے کہی ہیں اور ورلڈ بینک کے بارے میں یہ جان لیجئے کہ اس کا قیام اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد عمل میں آیا۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل قائم ہوا اور ۱۹۵۰ء میں ورلڈ بینک قائم ہو گیا۔ یہودی مالیاتی استعمار کا جو سب سے بڑا اور سب سے پہلا ادارہ وجود میں آیا وہ یہی ورلڈ بینک ہے۔

وطن کی فکر کر ناداں!

جہاں تک ہمارے دینی و مذہبی عناصر کا تعلق ہے تو ان کا معاملہ کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ وہی تفرقہ ہے' وہی تقسیم در تقسیم ہے اور وہی کشاکشِ اقتدار کی حاشیہ برداری ہے۔ ملک میں دو جماعتی سیاست کا جو رجحان پیدا ہو چکا ہے اس کے اعتبار سے پھر کمریں کسی جا رہی ہیں اور اس طرح کے شوشے چھوڑے جا رہے ہیں کہ اگر نواز شریف ہماری قیادت قبول کر لے تو ہم اس کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اور اگر نواز شریف کہہ دے کہ اسلام قائم کروں گا تو ہم اس کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ یعنی ہم تو ساتھ دینے کو تیار ہیں' تم خدارا کوئی ایسا لفظ کہہ دو جس سے ہماری عزت کا کچھ بھرم رہ جائے۔ اسے پنجابی کہتے ہیں

"چور نالوں پنڈ کاھلی"۔ یہ حال ہے کہ اس کشاکش اقتدار کے سوا کوئی راستہ سوجھ نہیں رہا۔ لہٰذا اسی کی حاشیہ برداری پر مجبور ہیں۔ اب اس پر میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

علامہ اقبال کی جو سب سے زیادہ معرکتہ الآرا نظم ہے وہ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ہے' جو درحقیقت ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کے پیغام کا نچوڑ ہے۔ اس لئے کہ کسی بھی مفکر یا فلسفی کا اصل فکر اس کی آخری عمر کے دور ہی میں سامنے آتا ہے۔ نبی کا معاملہ تو یہ نہیں ہوتا' کیونکہ وہ تو پہلے روز ہی سے وحی کے ذریعے اللہ سے براہ راست علم حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ البتہ ایک عام مفکر اور فلسفی کی فکر ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اور بہت سی منزلوں سے گزرتے ہوئے کہیں جا کر پختگی کو پہنچتی ہے۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ارمغانِ حجاز کی نظم ہے اور یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع بھی نہیں ہو سکی تھی' بعد میں شائع ہوئی ہے۔ اگر آپ کو ملتِ اسلامیہ کے نام اقبال کے پیغام کا خلاصہ نہایت شاندار اور نہایت مختصر الفاظ میں دیکھنا ہے تو وہ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ہے۔ اس کے آغاز میں تمہید ہے جس میں کہ ابلیس نے اپنی مجلس شوریٰ کا افتتاح "فرماتے" ہوئے چھوٹا سا خطاب "فرمایا" ہے۔ اس میں ایک شعر آیا ہے۔

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!

کاف و نون سے اصل میں مراد لفظ "کُن" ہے جس سے یہ کائنات وجود میں آئی۔ تو ابلیس کہہ رہا ہے کہ وہ اللہ جس نے اس کائنات کو لفظ "کُن" سے پیدا کیا تھا' اب نظر یہ آ رہا ہے کہ اب وہ خود اس کی بربادی کا فیصلہ کر چکا ہے۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!

اس لئے کہ فرشتوں نے تو کہا تھا کہ یا اللہ ہم حاضر ہیں' نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ' ہم آپ کی تسبیح و تحمید اور تقدیس میں لگے ہوئے ہیں' تو یہ خلافتِ ارضی کسی اور کو دینے کی ضرورت کیا ہے؟ ہم آپ کے نیازمند ہیں' آپ کے خادم ہیں۔ تو یہ جو انسان کو خلافتِ ارضی عطا کی گئی یہ گویا ع "ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں"

تھا۔ مذکورہ بالا دونوں شعروں کی ترتیب دراصل یوں ہے۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!

مجھے تو اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'خاکم بدہن' شاید پاکستان کی بربادی کا کوئی فیصلہ ملأ اعلیٰ میں ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میری اس بات کو غلط ثابت فرمادے۔ لیکن آثار سے تو یہی دکھائی دیتا ہے۔(Coming events cast their shadows before) اور جس طرح ہم سیکولرزم کی طرف اب بگٹٹ بھاگے جا رہے ہیں وہ پاکستان کی نفی ہے' دو قومی نظریئے کی نفی ہے۔ یہ ملک دو قومی نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اور جداگانہ انتخاب دو قومی نظریئے کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اب چونکہ اسی سے پسپائی ہو رہی ہے اور قومی سطح پر دھڑلے کے ساتھ ہو رہی ہے لہٰذا اس کے بعد اس ملک کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہے گی۔ اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اس کے لئے اب قانون پاس ہو گا اور ظاہر بات ہے کہ اس کے لئے انہیں قومی اسمبلی میں صرف ۵۱ فیصد اکثریت چاہئے جو انہیں مل جائے گی اور قانون پاس ہو جائے گا۔ البتہ اگر یہ باقاعدہ طور پر جداگانہ انتخاب کو ختم کر کے مخلوط انتخابات یہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں تو دستور میں ترمیم کرنی پڑے گی جس کے لئے دو تہائی اکثریت درکار ہوتی ہے' لیکن اس معاملے میں ترمیم کی احتیاج نہیں ہے۔ واللہ اعلم! دستوری ماہرین اگر چاہیں گے تو مقدمہ کرتے رہیں گے اور سپریم کورٹ میں مقدمہ چلتا رہے گا۔ لیکن بہرحال نظر تو یہ آ رہا ہے کہ ہم گویا کہ اپنی تباہی پر اور نظریہ پاکستان سے "تائب" ہونے پر دستخط کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر محبوب الحق بھارت جا کر کھل کر بات کہہ آئے ہیں اور یہاں چونکہ حکومت کرنی ہے لہٰذا کھل کر وہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ ان دونوں رویوں میں فرق یہ ہے کہ ایک تو "Cold blooded murder" ہوتا ہے' یعنی کسی کو بڑی سفاکی سے قتل کر دینا۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبوب الحق صاحب کا جو بھی "فرمان" ہے یہ اس کا مظہر ہے۔ اور دوسری طرف ہماری حکومت کا طرز عمل

"slow poisoning" کا مظہر ہے' یعنی آہستہ آہستہ تھوڑا سا زہر دے کر کسی کو ختم کرنا۔ اگر جداگانہ انتخابات کا معاملہ ختم ہو کر مخلوط انتخابات کی بات شروع ہو جاتی ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس ملک کی نظریاتی اساس ختم ہو چکی' جبکہ اس ملک کی کوئی دوسری اساس سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ بات میں اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ثابت کر چکا ہوں کہ اس ملک کی کوئی تاریخی اساس ہے نہ جغرافیائی اساس ہے' نہ اس کی کوئی قومی اساس ہے نہ نسلی اساس ہے۔ کوئی اساس اور بنیاد اگر ہے تو صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا کوئی اور بنیاد سرے سے ہے ہی نہیں۔ اور اگر وہی منہدم ہو گئی تو اس ملک کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

بہرحال یہ جو صورتحال ہے کہ ایک طرف سیکولرزم کی قوتیں اس قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اور دوسری طرف ہمارے مذہبی و دینی عناصر کا حال یہ ہے کہ وہ نہ صرف تفرقہ و انتشار کا شکار ہیں بلکہ انہیں سیاست بازی کا جو چسکہ پڑ گیا ہے اور کشاکشِ اقتدار کے اندر حصہ لینے کی جو عادت ہو گئی ہے' اس کے باعث ان کا معاملہ زیادہ سے زیادہ گیدڑ بھبکیوں کا رہ گیا ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہماری اس صورتحال پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بت کدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ

قومی و ملکی صورت حال آئینہ قرآنی میں

اپنی قومی و ملکی صورتحال پر مجموعی تبصرہ قرآن حکیم کے الفاظ میں بارہا آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں فکر بھی ہے اور ذکر بھی ہے۔ اور ذکر ایک تو اس پہلو سے کہ یہ اللہ کا ذکر ہے' اللہ کو یاد کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے' پھر یہ یاد دہانی اور نصیحت کے معنوں میں بھی ذکر ہے۔ اور دوسرے ان معنوں میں کہ اس میں تذکرہ موجود ہے آنے والوں کا بھی اور جو پچھلے گزرے ہیں ان کا بھی۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: فیہ نَبأُ ما قَبلَکم وخبرُ ما بعدَکم وحُکمُ ما بَینَکم۔ اس

اعتبار سے ہماری داستان اور ہماری تصویر قرآن حکیم کی دو سورتوں میں واضح طور پر موجود ہے۔ نظم کے حوالے سے قرآن حکیم کو سات گروپس میں تقسیم کیا جاتا ہے' جن میں سے ہر گروپ میں کچھ مکی اور کچھ مدنی سورتیں ہیں۔ اس اعتبار سے دوسرے گروپ کی مکی سورتیں الانعام اور الاعراف اور مدنی سورتیں الانفال اور التوبہ ہیں۔ سورۃ الاعراف کی تین آیات (۱۷۵' ۱۷۶' ۱۷۷) اور سورۃ التوبہ کی تین آیات (۷۵' ۷۶' ۷۷) میں ہماری صورتحال کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ ان دونوں مقامات کا تقابل کر کے دیکھئے کہ ان میں عددی اعتبار سے بھی کتنی حیرت انگیز مماثلت ہے۔ دو مکی سورتوں میں سے دوسری سورت سورۃ الاعراف اور دو مدنی سورتوں میں سے دوسری سورت سورۃ التوبہ ہے' اور پھر ان میں سے مقدم الذکر کی آیات ۱۷۵' ۱۷۶' ۱۷۷ اور مؤخر الذکر کی آیات ۷۵' ۷۶' ۷۷ پاکستان کی تشریح پر مشتمل ہیں۔

جہاں تک سورۃ التوبہ کی تین آیات کا تعلق ہے' ان کے بارے میں بارہا مفصل گفتگو کر چکا ہوں' آج "كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ" کے مصداق صرف یاد دہانی کے طور پر حوالہ دے رہا ہوں: وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ "ان (منافقوں میں سے) ایک خاص قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے نواز دے گا (غنی اور دولت مند بنا دے گا) تو خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور صالح ہو جائیں گے (بڑے پکے سچے مسلمان بن جائیں گے)" فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ "پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا تو انہوں نے بخل سے کام لیا (اپنی جیبیں بھی بند کر لیں اور تجوریوں کے دروازے بھی مقفل کر لئے) اور اعراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ لی (اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو بھول گئے)"۔ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○ "تو اس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق کا روگ پیدا کر دیا اس دن تک کے لئے جس دن یہ اللہ سے ملاقات کریں گے۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور اس لئے کہ وہ جھوٹ

بولتے رہے"۔ نَعوذ باللّٰہ مِن ذٰلک! نَعُوذ باللّٰہ مِن ذٰلک!! نَعُوذ باللّٰہ من ذٰلک!!! سورۃ التوبہ کی ان آیات کو پڑھتے ہوئے میں کانپ جاتا ہوں کہ کہیں خدانخواستہ ہمارے لئے توبہ کا دروازہ بند تو نہیں ہو گیا۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ ان الفاظ سے آپ مایوس نہ ہوں' ابھی وہ "یُغَرغَر" والی کیفیت نہیں آئی۔

یہ الفاظِ قرآنی اُس وقت کے منافقین پر تو صد فیصد نافذ ہو گئے تھے جنہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور قریباً یہی معاملہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کا ہے کہ ہم نے اعلان کیا: "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!" ہم نے رو رو کر دعائیں کیں کہ اے اللہ ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے اور ایک آزاد خطہ ارضی عطا فرما تو ہم وہاں تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ علامہ اقبال نے دسمبر ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں فرمایا کہ اگر ہمیں وہ ملک مل گیا اور ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو گئی تو اسلام کے چہرے پر دورِ ملوکیت میں جو پردے پڑ گئے تھے ہم انہیں ہٹا کر صحیح اسلامی تعلیمات کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ اور قائداعظم نے اپنی لاتعداد تقاریر میں فرمایا کہ ہمارا دستور قرآن ہے اور ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ لیکن ہم نے کیا نمونہ پیش کیا؟ وہی جاگیرداری اور سرمایہ داری! "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں علامہ اقبال نے ابلیس کا پیغام ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

اور ہمارا حال واقعتاً یہی ہے' ہمارے وہی لچھن ہیں' وہی قانون ہے' وہی جاگیرداری ہے' وہی زمینداری ہے' وہی بینکنگ ہے' وہی سودی معیشت ہے' وہی ڈیفنس سرٹیفکیٹ ہیں' وہی جوا ہے' وہی سٹہ ہے' سارے دھندے وہی ہیں بلکہ پہلے سے بہت زیادہ۔ بے حیائی و عریانی پہلے سے سوگنا زیادہ ہے۔ اور اس کا نتیجہ "نفاق" کی صورت میں نکل رہا ہے۔ ایک

طرف نفاقِ عملی اور دوسری طرف نفاقِ باہمی۔ چنانچہ قوم قومیتوں میں تقسیم ہو گئی ہے' اب وہ "قوم" کہاں ہے۔ ع ڈھونڈ اب اس کو چراغِ رخِ زیبا لے کر! اب تو قومیتیں ہیں اور ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی طریقے سے نفاق عملی کا معاملہ ہے۔ احادیثِ نبویہؐ میں منافق کی جو علامات بیان کی گئی ہیں' یعنی جھوٹ' وعدہ خلافی اور خیانت' وہ بحیثیتِ مجموعی پوری قوم میں پیدا ہو گئی ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ جب دجال آئے گا تو اس کی پیشانی پر "ک ف ر" (کفر) لکھا ہوا ہو گا' اسی طرح پاکستان کی سیاست کی پیشانی پر "جھوٹ' وعدہ خلافی اور خیانت" کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جو جتنا بڑا ہے وہ اتنا ہی بڑا جھوٹا' اتنا ہی بڑا وعدہ خلاف اور اتنا ہی بڑا خائن ہے' اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ' وَقَلِیلٌ مَّا ھُمْ۔ استثنائی مثالیں تو شاذ کے درجے میں ہوں گی۔ سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵' ۷۶' ۷۷ کی روشنی میں ہم اپنی پاکستانی قوم کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

البتہ سورۃ الاعراف کی آیات ۱۷۵' ۱۷۶' ۱۷۷ میں ایک فرد کی مثال دی گئی ہے : وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ الَّذِیْ اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا "(اے نبیؐ) آپ انہیں اس شخص کی خبر سنائیے (اس شخص کے حالات بتائیے) کہ جسے ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں"۔ آپ جانتے ہوں گے کہ "آیات" کا لفظ بہت سے معانی میں آتا ہے۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی بھی آیات ہیں' پھر آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی ہیں' آیات معجزات کو بھی کہتے ہیں اور کرامات کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ بنی اسرائیل میں سے ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جو بڑا باکرامت' بہت بڑا زاہد' عابد اور عالم تھا۔ فَانْسَلَخَ مِنْھَا "تو وہ ان (آیات کی پابندی) سے نکل بھاگا"۔ اس بدبخت نے محض ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے مقام رفیع سے نیچے گرنا شروع کیا۔ "فَانْسَلَخَ مِنْھَا" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ پہلے اس نے خود پسپائی اختیار کی' فَاَتْبَعَہُ الشَّیْطٰنُ "اب شیطان اس کے پیچھے لگ گیا"۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ شیطان کسی کو از خود گمراہ نہیں کر سکتا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ "میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"۔ گمراہ ہونے کا فیصلہ انسان خود کرتا ہے۔ اسی ابلیس نے قیامت کے دن کھڑے ہو کر کہہ دینا ہے : فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ کہ مجھے ملامت مت کرو' اپنے آپ کو ملامت

کرو! یہ کہے گا کہ اللہ نے بھی تم سے ایک وعدہ کیا تھا' وہ سچا وعدہ تھا اور میں نے بھی تم سے ایک وعدہ کیا تھا جو جھوٹا وعدہ تھا' تم نے میرے وعدے کو قبول کیا اور اللہ کے وعدے کو پھینک دیا۔ تو کون مجرم ہے؟ تم یا میں؟ پس مجھے ملامت مت کرو' بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو! تو یہ شخص خود اللہ کی آیات کی پابندی سے نکل بھاگا' اب شیطان کو اور کیا چاہئے تھا؟ اس نے اس کا پیچھا کیا۔ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ! "اور وہ انتہائی گمراہ لوگوں میں سے ہو کر رہ گیا"۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا "اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیات کے ذریعے بلندی عطا کرتے" یعنی ہم نے اسے جو آیات عطا کی تھیں' اسے جو علم عطا کیا تھا' جو کرامات عطا کی تھیں' جو اسے فہم دیا تھا' جو ہم نے اسے زہد و تقویٰ کی توفیق دی تھی' اگر ہم چاہتے تو اسے مزید بلند مقامات پر پہنچاتے وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ "لیکن وہ بدبخت زمین (اور زمینی خواہشات) ہی کی طرف جھکتا چلا گیا"۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ "اور اس نے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کی" فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ "پس اس کی مثال تو کتے کی سی ہے" اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ "اگر اس کے اوپر تم بوجھ ڈال دو تب بھی ہانپے گا" اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ "اور اسے چھوڑ دو (بوجھ نہ ڈالو) تب بھی ہانپتا رہے گا۔" اس کی زبان باہر نکلی رہے گی۔ میں قبل ازیں اپنے دروس و خطابات میں ان آیات کے مفہوم پر تفصیل سے روشنی ڈال چکا ہوں اور ان کے جو دو معانی ہو سکتے ہیں وہ بیان کر چکا ہوں' اِس وقت صرف حوالہ دے رہا ہوں۔ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا "یہی مثال اس قوم کی ہے جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا"۔ نوٹ کیجئے کہ ایک فرد کی مثال دے کر اسے ایک قوم پر منطبق کیا جا رہا ہے۔ اور اِس وقت اس مثال کا مصداقِ کامل مسلمانانِ پاکستان کی قوم ہے جو عزت و آبرو کے لحاظ سے کتے سے بدتر ہو چکی ہے۔ آپ بین الاقوامی سطح پر اپنی ساکھ کو دیکھئے کہ کس قدر گر چکی ہے کہ آج امریکہ کا سفیر کھڑا ہو کر کہہ دیتا ہے کہ "ہماری شرائط پر دوستی کرنی ہے تو کرو' ورنہ کوئی اور دوست تلاش کرو۔" کوئی حد ہے گراوٹ کی! اور ہمارا حال کیا ہے؟

میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ مرے فرش پر نہ رینگ!

یہ حال اس قوم کا ہو چکا ہے جو اللہ کے دین کے نام پر وجود میں آئی تھی۔ ذٰلِکَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا "یہ مثال اس قوم کی ہے جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا"۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ○ "تو اے نبی آپ یہ قصہ سنا دیجئے شاید کہ وہ غور کریں"۔ شاید کہ ان کو کچھ سوچنے سمجھنے کی اور اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی توفیق میسر آجائے۔

سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاَنْفُسَھُمْ کَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ○ "بری مثال ہے اس قوم کی کہ جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا"۔ اللہ کی آیات کو جھٹلا کر اللہ کا کیا بگاڑا؟ بے عزتی' بے حیثیتی اور ذلت اپنے ہی حصے میں آئی۔ آج ایک طرف بھارت کے خوف سے کانپ رہے ہیں۔ ادھر امریکہ کا دامن پکڑتے ہیں تو وہ دامن جھٹک دیتا ہے۔ اور یہ جان لیجئے پاکستان کا قیام واقعتاً اللہ کی ایک "آیت" یعنی معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی پشت پر اکابرینِ ملت کی چار سو برس کی تجدیدی مساعی ہیں' جن میں شیخ احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ دہلوی' سید احمد بریلوی' علامہ اقبال' مولانا مودودی' مولانا الیاس اور شیخ الہند (رحمہم اللہ علیہم) جیسی عظیم شخصیات ہیں۔ پھر قیام پاکستان کے بعد قرار دادِ مقاصد کا پاس ہو جانا بھی ایک معجزے سے کم نہیں۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے اس پر "فَانْسَلَخَ مِنْھَا" کے الفاظ صادق آتے ہیں' جن کی میں تشریح کر چکا ہوں۔ اور اس کا نتیجہ جو نکلا ہے وہ ہماری آج کی صورت حال سے عیاں ہے۔

آزادی کی گولڈن جوبلی یا لمحۂ فکریہ؟

ایک بات پر مزید توجہ کر لیجئے۔ یہ رمضان جو ابھی گزرا ہے' اس کی ستائیسویں شب کو پاکستان کی عمرِ عزیز قمری حساب سے پورے پچاس سال ہو چکی ہے۔ قیام پاکستان کے پچیس برس کے بعد ہماری پیٹھ پر عذابِ الٰہی کا ایک شدید کوڑا برسا تھا۔ یہ انتباہ کا کوڑا تھا کہ ملکِ خداداد پاکستان دولخت ہو گیا' ہمیں ہندو کے آگے ہتھیار ڈالنے کی شرمناک ذلت کا

سامنا کرنا پڑا اور ہمارے ۹۳ ہزار جنگی قیدی' جن میں سے غالباً ۴ ہزار ریگولر فوجی تھے' سپاہی سے لے کر جرنیل تک' اس ہندو کے قیدی بنے جس پر ہم نے کہیں ہزار برس' کہیں آٹھ سو برس اور کہیں چھ سو برس تک حکومت کی تھی۔ مزید یہ کہ مشرقی پاکستان میں موجود ہمارے اسلحہ کے ذخائر اور بہت بڑی مقدار میں فوجی ساز و سامان پر ہندو فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح سے ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست کی صورت میں بہت بڑا کلنک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر لگا۔ اب میں یہ سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ اگلے پچیس برس پھر مکمل ہو گئے ہیں۔

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی

اب کہیں وہ بات واقعتاً پوری نہ ہو جائے کہ

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے کار ساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!

یہ سلطنتِ خداداد اللہ کی عطا کردہ سلطنت ہے۔ آج (۸ مارچ ۹۶ء) کے نوائے وقت میں پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کی ایک نظم پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ آج سے پہلے انہوں نے ستر کی دہائی میں بھی ایک دردانگیز نظم کہی تھی ع کہ رہوارِ یقینِ مابصحرائے گماں گم شد! اور آج انہوں نے جو کہا ہے وہ بھی بہت صحیح تبصرہ ہے ع بدخواہ نہ ہو اس کا یہ دولت ہے خداداد! یہ پاکستان دولتِ خداداد ہے جس کی خیر خواہی ہم پر لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی شے ملتی ہے اور اگر کوئی احسان ہوتا ہے تو اس کا شکر ادا کرنا لازم ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے : لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝ "اگر تم شکر کرو گے تو ہم تم پر مزید احسانات کریں گے اور اگر تم نے کفرانِ نعمت کا معاملہ کیا تو ہماری سزا بھی بہت سخت ہے"۔

اور اس سزا کے بارے میں میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ السجدہ میں دو قسم کے عذابوں کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ السجدہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسے ہر جمعہ کی صبح کو نماز فجر کی پہلی رکعت میں پڑھا کرتے تھے۔ اس کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا :

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

"ہم انہیں لازماً چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے بڑے عذاب سے پہلے شاید کہ یہ لوٹ آئیں"۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے......!

اب پاکستان کی عمر عزیز کے دوسرے پچیس برس پورے ہونے پر مجھے عذاب کے جس کوڑے کا اندیشہ ہے' اللہ کرے کہ وہ اگر آئے بھی تو عذابِ ادنیٰ ہی کا ہو جس سے ہم جاگ جائیں۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ عذابِ اکبر یعنی عذابِ استیصال ہو اور اس کے بعد ع "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!" والا معاملہ ہو جائے۔ اعَاذَنَا اللّٰہ مِن ذٰلِکَ! بہرحال اپنا طرزِ عمل تو یہ ہے کہ ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

ہم نے یہ ملک بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم ایک مہینے سے بھی زیادہ حصار میں محصور رہے تھے جہاں ہر صبح بھی موت تھی اور ہر شام بھی موت تھی۔ صبح و شام حملے ہو رہے تھے۔ وہاں سے نکل کر بیس دن پیدل چل کر فی الواقع آگ اور خون کے دریا عبور کر کے ہم پاکستان پہنچے۔ ہم کیسی کیسی امیدیں لے کر یہاں آئے تھے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے میں نے تحریکِ پاکستان میں کم از کم دو سال تک مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو کر بہت بھرپور محنت اور کوشش کی۔ ضلع حصار کی فیڈریشن کا میں جنرل سیکرٹری تھا اور ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں فیڈریشن کا جو بہت بڑا اجلاس ہوا تھا جس میں قائداعظم تشریف لائے تھے' اس میں ہر ضلع سے فیڈریشن کے دو دو نمائندے شریک ہوئے تھے' اور ضلع حصار سے جو دو نمائندے آئے تھے ان میں سے ایک میں تھا۔ کن تمناؤں اور کن آرزوؤں کے ساتھ' آگ اور خون کے دریا عبور کر کے ہم یہاں آئے تھے' لیکن اب کہاں کھڑے ہیں؟ پچاس برس بیت گئے' لیکن قیامِ پاکستان کے مقصد کی طرف کوئی

مثبت پیش رفت نہیں ہوئی۔ مجھے اپنی حد تک تو یہ اطمینان ہے کہ میری زندگی میں کوئی دن ایسا نہیں آیا کہ جب اس مقصد سے میری نگاہیں ہٹی ہوں' الحمد للہ میں نے ہمیشہ اسی کے لئے جدوجہد کی ہے' لیکن سوال افراد کا نہیں ہوتا۔ اقبال نے بھی اسی نظم میں ابلیس سے یہ کہلوایا ہے۔

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو!

لیکن افراد سے کیا ہوتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ قوم کا کیا حال ہے؟ حُکمُ الاکثرِ حُکمُ الکُل۔ اسی حوالے سے عرض کر رہا ہوں کہ اللہ نہ کرے کہ وہ شکل پیدا ہو کہ ہم عذابِ استیصال کی لپیٹ میں آجائیں۔

بہرحال ہمارا طرزِ عمل یہی رہے گا جو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۶۴ میں بایں الفاظ مذکور ہوا:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا' قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

یعنی جب نہی عن المنکر کرنے والوں کو کچھ سمجھانے والوں نے سمجھایا تھا کہ تم اس ناہنجار قوم کو نصیحت کر کے کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتے ہو' یہ قوم اب ماننے والی نہیں ہے' اب یا تو اللہ اسے ہلاک کر دے گا یا اسے شدید عذاب سے دوچار کر دے گا' تو نہی عن المنکر کرنے والوں نے جواب دیا تھا کہ ہمیں تو تمہارے رب کے حضور معذرت پیش کرنی ہے (کہ اے اللہ ہم تو آخری سانس تک نہی عن المنکر کا کام کرتے رہے) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا پیدا ہو ہی جائے۔ تو یہ امید کا پہلو بھی ہے' جب تک سانس تب تک آس! بہرحال آس نہ بھی ہو تب بھی احساسِ فرض تو ہے جس کے تحت ہمیں اپنا کام کرتے رہنا ہے۔ بہرحال یہ دو تصویریں ہیں جو قرآن مجید کی تین تین آیات کے حوالے سے میں نے بارہا پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق کے بارے میں جناب الطاف گوہر کا مضمون

ڈاکٹر محبوب الحق صاحب کے بارے میں میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس ضمن میں میری مشکل آج بہت آسان ہو گئی ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ گزشتہ دو دنوں سے میں کس قدر سخت الجھن میں رہا' کیونکہ ان موضوعات پر گفتگو کے لئے بہت وقت چاہئے اور میں ایک ہی نشست میں تین چار موضوعات پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں ان تمام موضوعات سے کیسے عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ لیکن آج کے نوائے وقت میں الطاف گوہر صاحب کا مضمون دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ مضمون آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انہوں نے "بوب اور باب" کے حوالے سے اس شخص کا پورا شجرۂ نسب بیان کر دیا ہے۔ میرے علم میں تو یہ باتیں نہیں تھیں جو انہوں نے بیان کر دی ہیں' ورنہ میں یہاں تک تو پہنچ بھی نہیں سکتا تھا۔ الطاف گوہر صاحب کے مضمون سے یہ بات کھلی کہ ایک یہ "بوب" صاحب ہیں اور ایک "باب" صاحب تھے' رابرٹ میکن مارا۔ ان دونوں کا گٹھ جوڑ رہا ہے۔ پاکستانی سیاست کے ہر دور میں گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر یہ حکومتی ایوانوں میں موجود رہے اور ورلڈ بینک کے ایجنٹ کے طور پر معاشیات کے میدان میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ اس طرح کے لوگوں پر تھالی کے بینگن کی مثال صادق آتی ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ تھالی سونے کی ہے' چاندی کی ہے یا پیتل کی! وہ تو کھلم کھلا ورلڈ بینک کے ملازم ہیں اور اس حوالے سے نیو ورلڈ آرڈر کے ایجنٹ!--- انہیں تو اسی حوالے سے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ بقول شاعر۔

انہی کی محفل سنوارتا ہوں' چراغ میرا ہے' رات ان کی
انہی کی باتیں سنا رہا ہوں' زبان میری ہے' بات ان کی

بین الاقوامی سطح پر یہود کا کردار

میں آپ کو یاد دلا دینا چاہتا ہوں---- اور میں بڑی تفصیل سے یہ پورا پس منظر آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں' آج پھر تھوڑا سا درد غم آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں---- کہ ۱۷۷۶ء میں یہودیوں نے آرڈر آف ایلومیناٹی قائم کیا تھا۔ امریکہ کے ایک ڈالر کے نوٹ

پر "۱۷۷۶" کی تاریخ بڑے اہتمام سے شائع ہوتی ہے۔ عام امریکی شہری یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے سال آزادی کی تاریخ ہے جو یہاں درج ہے' حالانکہ دراصل یہ آرڈر آف ایلومیناٹی کی تاسیس کا سال ہے۔ اس ادارے کے قیام کے پس پردہ مقاصد کیا تھے؟ دنیا میں کسی بھی جگہ کوئی بھی ذہین فطین اور باصلاحیت آدمی ابھرتا نظر آئے' دنیا میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص' اسے فوراً چک لو۔ خواہ وہ آدمی مذہبی ذہن رکھتا ہو خواہ وہ سیکولر ہو۔ اسے دولت اور شہرت' یا سیکس سکینڈل میں پھنسا کر اپنے قابو میں کرلو۔ اور اسے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل میں استعمال کرو۔ اگر وہ قابو میں نہ آئے تو موت کے گھاٹ اتار دو۔ یہ آرڈر آف ایلومیناٹی ۱۷۷۶ء سے برسر عمل ہے۔ اسی آرڈر آف ایلومیناٹی کے تحت فری میسن کا قیام عمل میں آیا۔ اسی فری میسن نے ترکی کے ابھرتے ہوئے لیڈر مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنے دام میں پھانسا اور اس کے ہاتھوں خلافت کے ادارے کو ختم کرایا۔

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ' اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یہ سب کچھ انہوں نے ایک مسلمان کے ہاتھوں کرایا۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ حال ہی میں قیام امریکہ کے دوران مجھے مولانا مودودی مرحوم کی ایک تقریر کا ریکارڈ ملا ہے۔ ۷۰ء کے الیکشن سے پہلے انہوں نے رشید پارک اچھرہ میں یہ تقریر کی تھی۔ اس میں انہوں نے ہندوستان کی رواں صدی کی تاریخ کا جو تذکرہ کیا اس میں تحریک خلافت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ ہندوستان کا مسلمان خلافت کو بچانے کے لئے عظیم ترین قربانیاں دینے پر اتر آیا تھا۔ ہزاروں لوگ اس کی خاطر ہجرت کر گئے' ہزاروں جیلوں میں چلے گئے' خلافت کی حفاظت کے لئے کروڑوں کا چندہ جمع ہوا۔ پورا ہندوستان اس نعرے سے گونج اٹھا:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

لیکن اس خلافت کی قبا کو ایک ترک لیڈر نے بڑے آرام سے چاک کر دیا اور ساری تحریک جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ مدعی ست گواہ چست!!--- یہ کام مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں کرایا گیا جو فری میسن تحریک کا رکن تھا۔

بہرکیف آرڈر آف ایلومیناٹی کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ جہاں بھی کوئی ذہین آدمی ابھرتا ہوا نظر آئے اسے اچک لو۔ اسے کسی سیکنڈل میں پھانس کر قابو کر لو تاکہ اس کی ذہانت اور صلاحیت کہیں ہمارے خلاف استعمال نہ ہو سکے بلکہ وہ ہمارے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ جائے کہ جہاں چاہیں اسے استعمال کریں۔ اور اگر وہ ہمارے قابو میں نہیں آتا تو اس کا پتہ چاک کر دو۔ لیاقت علی خان کا پتہ بھی اسی وجہ سے چاک کیا گیا۔ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کس نے قتل کیا۔ ابھی چند ماہ قبل عمرے کے سفر میں ایک صاحب نے ایک عجیب بات مجھے بتائی۔ میں حیران ہوں میرے علم میں اب تک یہ بات نہیں تھی' اور آپ میں سے بھی شاید بہت سے حضرات کے علم میں نہ ہو۔ وہ صاحب گزشتہ تقریباً تیس برس سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ عمر میں مجھ سے شاید ایک دو سال بڑے ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۴۹ء میں کراچی میں جو "پاکستان ڈے پریڈ" ہوئی تھی اس میں چودہ مسلمان ممالک کے فوجی دستوں نے حصہ لیا تھا اور لیاقت علی خان نے اس موقع پر ببانگِ دہل کہہ دیا تھا: "پوری دنیا سن لے' ہم تنہا نہیں ہیں"۔

لیاقت علی خان کی یہ للکار ناقابل معافی تھی۔ چودہ مسلم ممالک کے فوجی دستوں کی مشترک پریڈ دشمنان اسلام کے لئے خطرے کی ایک بہت بڑی گھنٹی تھی۔ گویا کہ پین اسلام ازم کا وہ خواب جو کبھی سید جمال الدین افغانی نے دیکھا تھا' اس کی ایک جھلک دنیا نے پاکستان ڈے پریڈ کی صورت میں دیکھ لی۔ یہ خوف ہندو کے سر پر بھی مسلط تھا۔ چنانچہ گاندھی جی نے ایک بار قائداعظم سے ملاقات میں نہایت خوف زدہ انداز میں یہ سوال کیا تھا کہ "آپ کے پاکستان کا مطلب پین اسلام تو نہیں ہے ناں؟" انہیں خوب اندازہ تھا کہ ہندو تو صرف ہندوستان میں آباد ہے' جبکہ مسلمان پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ مسلمان اگر ایک امت کی صورت میں متحد ہو گئے تو ہماری کہاں جان بخشی ہو گی۔ یہ تھا جرمِ عظیم لیاقت علی خان کا!

آگے چلئے' شاہ فیصل شہید کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ انہیں ان کے ایک بھتیجے کے ہاتھوں قتل کروایا گیا' جس کا ایک فوٹو اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں ایک یہودی عورت کو اس کی گردن پر سوار دکھایا گیا تھا۔ شاہ فیصل کا جرم یہ تھا کہ وہ عالم اسلام کے اتحاد

کے ایک بہت بڑے سفیر کے طور پر ابھر رہے تھے۔ ذرا ۱۹۷۴ء کی اس عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کو ذہن میں لائیے جو پاکستان میں منعقد ہوئی تھی اور ہر سو "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا" کے قرآنی الفاظ گونج رہے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی اس سازش کا شکار ہوا۔ اس شخص نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ ہنری کسنجر نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ تمہیں سبق سکھادیا جائے گا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ پاکستان نے اگر ایٹم بم بنالیا تو اصل خطرہ اسرائیل کے لئے ہوگا۔ وہ جانتے ہیں کہ اسرائیل کا توڑ اگر پوری دنیا میں کوئی ہے تو وہ پاکستان ہے۔ خدائی تدبیر دیکھئے' اسرائیل کی ریاست ۱۹۴۸ء میں قائم ہوئی' اس سے ایک سال قبل ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہو گیا۔ جیساکہ ایک حدیث کے الفاظ ہیں : "ما انزل اللّٰهُ مِن داءٍ الا انزل له دواءً" کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی نہیں اتاری جس کا علاج نہ اتار دیا ہو' کچھ اس طرح کا معاملہ یہاں بھی نظر آتا ہے--- بہرکیف ایٹم بم بنانے کا اعلان ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا۔

اسی طرح کی ایک مثال ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی کی ہے۔ انہوں نے ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس کے نام سے امریکہ میں ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کے تحت IIIT یعنی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (International Institute of Islamic Thought) کا قیام عمل میں آیا' لیکن پھر انہیں بیوی سمیت قتل کرادیا گیا۔ فکر کے میدان میں کسی مسلمان کا ابھر کر سامنے آنا اور معاشیات اور سیاسیات کے میدان میں اسلام کی تعلیمات کو اجاگر کرنے کے لئے امریکہ میں علمی ادارے کا قیام انہیں گوارا نہ تھا۔ اسی طرح کا معاملہ ہوا عمران خان کے ساتھ۔ وہ شخص بہرحال ایک ہیرو کی حیثیت سے ابھر آیا تھا۔ اسلام کی طرف اس کا جھکاؤ ان طاقتوں کے نقطہ نظر سے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا' لہٰذا اسے بھی اچک لیا گیا۔ اب ایک بہت بڑا یہودی بینکر اس کا سسر ہے۔ وہ شخص جس سے اسلام کے حوالے سے بہت اونچی توقعات وابستہ کی جانے لگی تھیں' یہودیوں کی سازش کا شکار ہو کر اپنا وہ مقام کھو چکا ہے۔

فری میسن تحریک کے تحت یہود کے آلہ کار بننے والے ذہین اور باصلاحیت افراد کی

فہرست میں ایک نام معین قریشی صاحب کا بھی ہے۔ وہ بھی ورلڈ بینک کے نمائندے ہیں۔ یک بیک امپورٹ ہو کر یہاں آکر وزیر اعظم بن جاتے ہیں۔ لوگ حیران ہیں کہ یہ کون صاحب ہیں' اچانک کہاں سے نمودار ہو گئے ہیں!!! ان کا وزیر اعظم بن جانا نواز شریف کو بھی قبول ہے اور بے نظیر صاحبہ بھی اس پر راضی نظر آتی ہیں۔ اور کیسے نہ ہوں؟ ان کی تقرری کا حکم نامہ واشنگٹن سے آیا ہے!!! اسی کی ایک مثال اب محبوب الحق صاحب کی صورت میں سامنے آئی ہے جن کے بارے میں پروفیسر مرزا منور صاحب کے یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں: "محبوب چچا سام کے' محبوب ہمارے"۔

میں نے تو اخباری اعلان میں ان کے نام کی مناسبت سے یہ الفاظ درج کئے تھے کہ "وہ محبوبِ حق تعالیٰ ہیں یا صیونیت کے ایجنٹ؟"۔ اس لئے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ نظریہ پاکستان کی صریحاً نفی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "نوائے وقت" میں الطاف گوہر صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد میری مشکل بہت آسان ہو گئی ہے کہ مجھے اب اس پر کچھ زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ (رفقاء و احباب کی سہولت کے لئے جناب الطاف گوہر کا یہ مضمون ۲۶/ مارچ کے ندائے خلافت میں شائع کر دیا گیا ہے)۔ ان کے مضمون سے مجھے صدفی صد اتفاق ہے' سوائے ایک بات کے' جس کا تذکرہ میں بعد کروں گا۔

مسئلۂ کشمیر اور ڈاکٹر محبوب الحق

محبوب الحق صاحب کے فرمودات کے دو حصے ہیں۔ پہلا یہ کہ کشمیر کو دس سال کے لئے یو این او کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کو بھی اور پاکستانی "مقبوضہ" کشمیر کو بھی۔ بہت صحیح گرفت کی ہے یہاں الطاف گوہر صاحب نے کہ انہوں نے "آزاد کشمیر" نہیں کہا' بلکہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر اور ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے الفاظ استعمال کئے ہیں کہ ان دونوں کو یو این او کے حوالے کر دیا جائے۔ صاحب مضمون نے ٹھیک یاد دلایا ہے کہ بعینہٖ یہی معاملہ فلسطین کا ہوا تھا کہ اس کو پہلے U.N.O کے حوالے کیا گیا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ یہی تاریخ اپنے آپ کو دہرانا چاہتی ہے یا یوں کہئے کہ یہودی اس تاریخ کو دہرانا چاہتے ہیں۔ اور ہمارے اپنے باحیثیت لوگوں کے ذریعے جو در حقیقت ان

کے ایجنٹ ہیں' اس ناپاک مقصد کے لئے راہ ہموار کرنے کے درپے ہیں۔

اس ضمن میں میری مستقل رائے کئی بار آپ حضرات کے سامنے آچکی ہے کہ کشمیر کے مسئلے کو یو این او کے حوالے کرنے کا فیصلہ ایک "انڈی پینڈنٹ کشمیر" کو وجود میں لائے گا' جو اصل میں امریکہ کا ایک مستقل اڈا ہوگا' جس کے بنیادی مقاصد میں چین کو Contain کرنے اور اس کی کڑی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ بھارت پر مسلط رہنا بھی لازمی طور پر شامل ہوگا۔ اس لئے کہ بھارت بھی تو بہرحال ایک بڑا ملک ہے جو ایک عرصے سے ورلڈ پاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے' اس کی نیوی سے تو آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ جیسے دور دراز ممالک بھی کانپ رہے ہیں۔ پورا بحر ہند اس کے قبضے میں ہے۔ لہٰذا بھارت کو قابو میں رکھنا بھی ضروری ہے۔ روسی ترکستان کی ریاستیں بھی ساتھ ہی ملحق ہیں' انہیں بھی قابو میں رکھنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان اور افغانستان پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس سارے کام کے لئے کشمیر ایک بہترین اڈا ثابت ہو سکتا ہے۔ وہی فلسطین کی تاریخ یہاں دہرائی جائے گی۔ ایک اسرائیل وہاں بنا' اسی طرح کا ایک اسرائیل یہاں قائم کرنا ان کے پیش نظر ہے۔ اسی کے لئے درحقیقت یہ سارے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔

تاہم کشمیر کے بارے میں جو دوسری بات الطاف گوہر صاحب نے کہی ہے اس سے مجھے جزوی طور پر اختلاف ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمیں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے اوپر ڈٹے رہنا چاہئے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ حکومت پاکستان کا موقف تو یہی رہنا چاہئے' لیکن اس سے مسئلہ حل کبھی نہیں ہوگا۔ بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ اگر کہیں بھارت عاجز آگیا اور اس نے تنگ آکر اس مسئلے کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا تو اس کا نتیجہ "آزاد" کشمیر کی صورت میں نکلے گا' پاکستان اور بھارت دونوں بالکل بے دخل ہو جائیں گے۔ لیکن حکومتی سطح پر اسی موقف پر ڈٹے رہنے کی حکمت بہرحال سمجھ میں آتی ہے۔ سردست ہمیں ڈٹے رہنا چاہئے۔ لیکن غیر حکومتی سطح پر جو بھی ذرائع ہو سکتے ہیں ان کو بروئے کار لا کر مسئلے کے حل کی کوشش ہونی چاہئے میں نے بارہا کہا ہے کہ ایران اور چین کے good offices کو استعمال کیجئے۔ اور دو طرفہ مذاکرات کے ذریعے کوئی معقول مفاہمت کا راستہ تلاش کیجئے۔ اس مفاہمت یا Settlement کی بہترین شکل یہی دکھائی دیتی ہے کہ تقسیم کے ایجنڈا کو

نامکمل مانتے ہوئے کشمیر کے مسئلے کے حل کی جانب پیش قدمی کی جائے۔ اور اس تنازعہ کو جو گزشتہ پچاس برس سے پاکستان اور ہندوستان کے مابین باعث نزاع اور وجہ کشیدگی ہی نہیں' ملکی ترقی کی راہ کی بھی ایک بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے' گفت و شنید کے ذریعے حل کیا جائے۔ تقسیم صرف ہندوستان ہی کی نہیں ہوئی' یہ امرِ واقعہ ہے کہ پنجاب کی بھی تقسیم ہوئی اور بنگال کی بھی ہوئی۔ تو کشمیر کی بھی تقسیم پر اگر معاملہ طے ہو جائے تو یہ حقیقت پسندی کا مظہر ہو گا۔ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ بھارت کے پاس رہے اور مسلم اکثریت کا علاقہ پاکستان کے پاس رہے۔ بالآخر پاکستان اور بھارت کو یہی معاملہ کرنا پڑے گا' لیکن یہ فیصلہ کوئی آسان فیصلہ نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑی محنت سے زمین ہموار کرنی ہو گی۔ جس کے پاس بھی رائے عامہ کو قائل کرنے کے مناسب ذرائع موجود ہوں اسے ان ذرائع کو بروئے کار لانا چاہئے۔ دونوں طرف کے لوگوں کو یہ سمجھانا ہو گا کہ آپس میں لڑتے رہنے کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ بلیاں لڑتی رہیں گی اور بندر پوری روٹی لے جائے گا۔ دونوں ممالک کے عوام میں اس کا احساس اور شعور پیدا کرنا دانشوروں کا کام ہے۔

محبوب الحق صاحب کا بیان--- ایک الجھن اور اس کا حل

محبوب الحق صاحب جو راگ الاپ رہے ہیں اس میں یہ بات میرے لئے اب تک ناقابل فہم تھی کہ وہ کھلم کھلا پاکستان کے درپے کیوں ہو گئے۔ یہ بیان انہوں نے کیوں دیا۔ کہ ہماری اگلی نسل اب سوچ رہی ہے کہ پاکستان اور بھارت کی اس تقسیم کو اب ختم کیا جائے۔ یہ بیان دینے سے پہلے انہوں نے سوچا تو ضرور ہو گا کہ پاکستان میں رائے عامہ پر اس کا اثر یقیناً منفی ہو گا۔ وہ ایک ذہین آدمی ہیں' بلا سوچے سمجھے کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ پھر یہ کہ میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ بھی یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ یہ تقسیم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ متحدہ ہندوستان (United India) تو امریکہ کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جائے گا۔ وہ تو جتنا کچھ بھارت اس وقت ہے وہ بھی ان کے لئے خطرہ بن رہا ہے۔ اس نے دھڑلے کے ساتھ ۷۶ء میں ایٹمی دھماکہ کیا' پھر امریکہ کی مسلسل تنبیہات کے باوجود میزائل پر میزائل بنا رہا ہے۔ انؐ کی کسی دھمکی کو خاطر میں نہیں لا رہا۔ اس کا وزیر داخلہ پارلیمنٹ کے اندر

کھلم کھلا یہ بات کہتا ہے کہ کشمیر کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے' یہ سب امریکہ کروا رہا ہے' امریکہ کی اپنی نیت خراب ہے۔ یہ کسی عام آدمی کی بات نہیں ہے بھارتی وزیر داخلہ کا بیان ہے۔ اس حوالے سے یہ سوال دو دن میرے ذہن میں اٹکا رہا کہ محبوب الحق صاحب نے یہ بات کیسے کہہ دی کہ یہ پاک بھارت تقسیم اب ختم ہو جانی چاہئے! یہ تو رائے عامہ کو اپنے خلاف کرنے والی بات ہے!! آخر اللہ نے عقل سمجھا دیا اور بات سمجھ میں آ گئی۔ پاکستان کے عوام کے مخالفانہ ردعمل کی انہیں کوئی پروا نہیں ہے۔ یوں بھی پاکستان میں رائے عامہ نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ یہاں تو کچھ سیاسی کھلنڈرے ہیں جن کی حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ وہ چاہے نواز شریف ہوں چاہے بے نظیر ہوں' دونوں امریکہ کی جیب میں ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کی حکومت کے بارے میں انہیں بھی شاید یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ مجاہدینِ کشمیر کے ہاتھوں اب زچ ہو چکی ہے۔ آخر کب تک سلسلہ چلے گا۔ کشمیری مسلمان اگر شہید ہو رہے ہیں' ان کی عورتوں پر اگر ظلم ہو رہا ہے تو کیا ہندوستان کی اپنی فوج وہاں نہیں مر رہی۔ ارب ہا ارب روپیہ خرچ نہیں ہو رہا؟ بنیئے کے لئے یہ خرچ کا معاملہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ تو بھارتی حکومت ان کا اصل مسئلہ نہیں ہے' وہ تو شاید تنگ آ کر یہ مسئلہ یو این او اور امریکہ کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو جائے' اصل مسئلہ وہاں کے عوام کا ہے اور عوام سے یہ بات منوانا آسان نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا ہے سردار عبدالقیوم صاحب نے کہ یہ بات جس کا تم ہمیں مشورہ دے رہے ہو پہلے بھارت سے منواؤ۔ گویا کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ سردار عبدالقیوم صاحب کو بھی محبوب الحق صاحب کی بات سے اختلاف نہ ہو۔ انہوں نے اپنا اختلاف ریکارڈ نہیں کرایا۔ محبوب الحق صاحب سے یہ ضرور کہا کہ یہ بات وہاں منواؤ۔ گویا کہ بھارت اگر مان لے تو کوئی حرج نہیں!! لیکن وہاں پر ہندو فنڈامینٹلسٹ طاقت ابھر کر آ گئی ہے' وہ کشمیر کو ہاتھ سے دینے پر کسی طرح آمادہ نہیں۔ اسے رام کرنے کے لئے یہ رشوت پیش کرنا ضروری تھا کہ بھئی کشمیر کے معاملے کو ایک بار یو این او کے حوالے تو کرو' ہم پورا پاکستان تمہاری جھولی میں ڈالنے کو تیار ہیں۔ بات سمجھ میں آتی ہے۔ دیوانے کی بڑ یونہی نہیں ہے۔ ربط محکم اسی بے ربطیٔ تحریر میں ہے! محبوب الحق صاحب کو خوب اندازہ ہے کہ جب تک وہ پاکستان کے بارے میں یہ نہیں کہیں گے کہ یہ غلط بنا اور

ہماری آئندہ نسل اس کو ختم کرنے کے لئے پر تول رہی ہے' میری اپنی اولاد یہ کہہ رہی ہے کہ یہ تقسیم غلط ہے' اس وقت تک ہندو اس بات پر دھیان دینے کو تیار نہیں ہو گا۔ وہاں کی رائے عامہ کو اگر کوئی رشوت دینی ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ تو اسی راستے سے ہو گی۔ بہرحال اس پر محترم مرزا منور صاحب کی جو فریاد نوائے وقت میں شائع ہوئی ہے وہ واقعتاً پڑھنے کے لائق ہے۔ (اس نظم کو بھی زیر نظر شمارے میں شائع کر دیا گیا ہے) انہوں نے بالکل صحیح فرمایا ہے :

محبوب چچا سام کے' محبوب ہمارے
یارو ہے یہی عالمِ اسلام کی افتاد
تو ربِّ رحیم اور یہ رسی کی درازی
ہو گی تو درازی کی بھی مولا کوئی میعاد

اس دوسرے شعر کو میں دو طرفہ دیکھتا ہوں۔ مرزا منور صاحب نے اگرچہ کسی اور رنگ میں کہا ہے' لیکن میں اس سے یہ مفہوم لیتا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری رسی بھی اب اللہ کے ہاں کٹ رہی ہو۔ پچاس برس تک اللہ نے رسی دراز کئے رکھی۔ یہ رسی اب صرف محبوب الحق کی کٹے گی یا پوری قوم کی رسی اب کٹنے والی ہے! خاکم بدہن' لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ معاملہ پورے پاکستان پر بھی صادق آتا ہے کہ "ہو گی تو درازی کی بھی مولا کوئی میعاد!"۔ قرآن حکیم میں یہ مضمون کئی بار وارد ہوا ہے :

﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾

"ہر قوم کے لئے بھی ہم نے ایک اجل معین کر دی ہے' جب وہ اجل آجاتی ہے تو پھر نہ وہ ایک گھڑی آگے جا سکتی ہے نہ پیچھے"۔

اللہ نہ کرے کہ ہماری اجلِ معین آچکی ہو۔ اللہ کرے کہ اس کی جانب سے اگر کوئی پکڑ آئے بھی تو وہ صرف "عذابِ ادنیٰ" کے درجے کی ہو کہ ہم جاگ جائیں' قومِ یونس کی طرح کی اجتماعی توبہ کریں' اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگیں اور پھر اپنی اصل منزل کی طرف رخ کریں۔

پاکستان : دولتِ خداداد

مرزا منور صاحب کی اس نظم کے پہلے شعر کا یہ مصرع بھی میرے نزدیک نہایت بامعنی اور قیمتی ہے کہ "بد خواہ نہ ہو اس کا' یہ دولت ہے خداداد!" میری پختہ رائے ہے کہ واقعتاً یہ دولتِ خداداد پاکستان ہے۔ یہی سرزمین ان شاءاللہ 'عالمی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نقطۂ آغاز بنے گی۔ البتہ تین ممکنہ صورتوں میں سے کوئی ایک شکل مسلمانانِ پاکستان کے لئے ہو گی۔ میری کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی حال اور مستقبل" کے آخری صفحہ پر اس کی تفصیل میں نے درج کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عذاب کے کسی کوڑے کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق دے دے۔ یہ سب سے عمدہ صورت ہو گی کہ جس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے آثار دور دور تک کہیں نظر نہیں آتے۔ تاہم ہم معجزے پر یقین رکھتے ہیں' اللہ کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے۔ دوسری امکانی صورت یہ ہے کہ اللہ کی سزا کا کوئی ایک جھٹکا ہمیں لگے اور ہمیں ہوش آ جائے۔ جیسا کہ سورۃ السجدہ میں وارد ہوا : وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ یہ بھی گھاٹے کا سودا نہیں ہو گا اگر ہم جاگ جائیں۔

تیسری اور آخری صورت جو یقیناً بہت کڑوی ہے اور ہماری دعا ہے کہ اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے' یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کروڑوں کی تعداد میں ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہوں' اور پھر ہندو اسلام لے آئیں۔ جیسے تاریخ میں ایک موقع پر تاتاریوں کے ہاتھوں کروڑوں مسلمان قتل ہوئے' لیکن پھر اسلام نے تاتاریوں کو فتح کر لیا۔ اسی طرح اب بھی اسلام ہندو کو فتح کر سکتا ہے۔ بہرکیف مجھے نظر یہی آتا ہے کہ عالمی غلبۂ اسلام کا نقطۂ آغاز بالآخر یہی سرزمین بنے گی۔ واللہ اعلم! اسلام کسی ایک قوم یا نسل کا محتاج نہیں ہے۔ ہم اگر اس لائق نہیں ہیں تو ہندوؤں کو یہ توفیق مل سکتی ہے' اسلام کے عالمی غلبہ کا نقطہ آغاز بننے کی سعادت ان کے حصے میں آ سکتی ہے۔ تاریخ میں اس سے پہلے عربوں کو معزول کیا جا چکا ہے۔ سورۂ محمد (ﷺ) کی آخری آیت میں صاف طور پر انہیں سنا دیا گیا تھا : "اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ" یعنی "تم اگر پیٹھ دکھا دو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی

اور قوم کو لے آئے گا"۔ عربوں کو معزول کیا گیا۔ آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو محل سے گھسیٹ کر تاتاریوں کے گھوڑوں کی سموں تلے کچلا گیا اور عرب قوم کا عظیم اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد منصب خلافت پر ترک فائز ہو گئے۔ عالم اسلام میں ہر طرف ترکوں کی حکومت تھی۔ یہ انہی تاتاریوں کی اولاد تھے۔ خواہ وہ ترکان تیموری ہوں یا ترکان صفوی' اور ترکان سلجوقی ہوں یا ترکان عثمانی۔ چار سو برس تک خلافت ترکان عثمانی کے پاس رہی۔

مخلوط انتخابات۔ نظریہ پاکستان کی نفی

انتخابی اصلاحات کے بارے میں صرف دو باتیں عرض کروں گا کہ اس میں دو پہلو یقیناً اچھے ہیں۔ جو اچھی بات ہے اسے اچھا کہئے اور جو بری ہے اسے برا کہئے۔ ایک ہی دن کے اندر مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا فیصلہ اچھا فیصلہ ہے' اس کی تائید کی جانی چاہئے۔ اسی طرح پبلسٹی پر جتنی بھی پابندیاں لگائی جا سکیں' جتنا بھی اس بخار کو کم کیا جا سکے اچھا ہے' بشرطیکہ اس پر فی الواقع عمل کیا جا سکے۔ لیکن اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینا میرے نزدیک نظریہ پاکستان کی صریحاً نفی ہے۔ اس معاملے میں خواہ ارشاد احمد حقانی صاحب اپنی منطق بھگار رہے ہوں یا اس کے جواز کے لئے دستور کا حوالہ تلاش کیا جا رہا ہو' اس فیصلے کی ہرگز تائید نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ دستور میں اس بارے میں کیا لکھ دیا ہے' تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں دستور کا ایکسپرٹ نہیں ہوں۔ ہاں' میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہمارا دستور چوں چوں کا مربہ ہے' تضادات کا شکار ہے۔ اگر قرارداد مقاصد ایک اعتبار سے اس دستور کا ایک حصہ ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اس کے مخالف اور متضاد چیزیں بھی اسی دستور میں موجود ہیں۔ ایک موقع پر سندھ ہائی کورٹ نے قرارداد مقاصد کو مقدم رکھ کر بعض فیصلے دیئے تو ہماری سپریم کورٹ نے اس سے متصادم دفعات کے حوالے سے ان فیصلوں کو رد کر دیا۔ اور یہ فیصلہ دینے والے جناب سید نسیم حسن شاہ صاحب تھے۔ انہوں نے کہا کہ قرارداد مقاصد بائنڈنگ نہیں ہو گی' دوسری چیزیں بائنڈنگ ہوں گی!!! یہ چرکے ہمیں اپنوں ہی کے ہاتھوں لگے ہیں۔ بہرکیف مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ اس بارے میں دستور میں کیا ہے' لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینا نظریہ پاکستان کی نفی ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قومیت کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا۔ اس کا سب سے

بڑا مظہر اور منطقی تقاضا جداگانہ انتخابات ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم اس رخ پر مزید آگے بڑھتے۔ میرے نزدیک اسلامی ریاست میں قانون ساز ادارے (Legislature) کے اندر کسی غیر مسلم کی شرکت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح اعلیٰ سطح کے پالیسی ساز مناصب پر بھی غیر مسلموں کی تقرری کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ ہمیں تو اس رخ پر آگے بڑھنا چاہئے تھا تاکہ ایک صحیح اسلامی ریاست وجود میں آتی۔ لیکن ترقی معکوس ہو رہی ہے۔ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ جداگانہ انتخابات کا سلسلہ ختم کرنے کا اگر فیصلہ کر ہی لیا گیا ہے اور جنرل الیکشن میں اگر ہندوؤں' عیسائیوں اور قادیانیوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ووٹ ڈالنا ہے تو یہ اضافی رشوت دینا کیوں ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے لئے اسمبلی میں علیحدہ نشستیں بھی محفوظ ہیں!! یہ تو "چپڑی اور دو دو" والی بات ہے!--- میں نے آج سے چار سال قبل یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اب اس ملک میں ننگے سیکولرزم کا راج ہو گا اب وہ اندیشہ ایک حقیقت بن کر سامنے آچکا ہے۔ اس معاملے میں مزید کچھ کہنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

تاہم ہمارے بعض علماء کا یہ وطیرہ بن گیا ہے کہ وہ بلند بانگ دعوے کرنے اور تیز و تند بیانات جاری کرنے میں بہت سرگرمی دکھاتے ہیں کہ اگر ہمارے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو ہم یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے' زبردست عوامی تحریک چلائیں گے' وغیرہ۔ شناختی کارڈ پر مذہب کے خانے کے اندراج کے مسئلے پر یہی کچھ ہوا تھا۔ علماء کرام کی طرف سے اس قسم کے بیانات سامنے آئے تھے' لیکن ہوا کیا؟ وہ بیانات ہوا میں تحلیل ہو گئے اور بس! بھئی اگر کچھ کرنا نہیں ہے تو ان گیدڑ بھبکیوں سے کیا حاصل! یہ تو مزید اپنی پوزیشن کو کمزور کرنے والی بات ہے۔

پہلے ہی اپنی کونسی ایسی تھی آبرو
پر شب کی منتوں نے تو کھو دی رہی سہی!

اس قسم کے بیانات زیادہ تر ان علماء کی جانب سے آتے ہیں جن کی اپنی کوئی جماعت نہیں ہے۔ باقی رہا دینی جماعتوں کا معاملہ تو وہ اپنی اسی سابقہ روش پر مصر ہیں۔ وہی کشاکش اقتدار' وہی انتخابی سیاست کی رسہ کشی میں کبھی کسی ایک سیکولر جماعت کی طرفداری اور کبھی دوسرے سیکولر گروپ کے ساتھ پیمان وفاداری! نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات!

واحد راہ عمل

میرے نزدیک اصلاح احوال کا راستہ ایک ہی ہے۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں

ہے۔ صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

۱۔ انتخابی سیاست سے یہ تمام جماعتیں علیحدگی اختیار کرلیں اور اسمبلیوں اور سینٹ سے بلا تاخیر استعفے دے کر الگ ہو جائیں۔ وہاں رہ کر وہ کوئی موثر رول تو ادا کر نہیں سکتے' سوائے اس کے کہ کسی معاملے میں کوئی احتجاجی آواز بلند کر دی' جس کی حیثیت نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں ہوتی!

۲۔ احتجاجی سیاست کے لئے دینی جماعتوں پر مشتمل متحدہ محاذ بنایا جائے۔ اور یہ اسی وقت موثر ہو گا جبکہ آپ اس انتخابی سیاست سے کنارہ کشی کر چکے ہوں۔ ورنہ قوم یہ کہنے میں حق بجانب ہو گی کہ کل تم فلاں سیاسی جماعت کے ساتھ تھے' آج تم کسی اور سیاسی اتحاد کا حصہ ہو' پہلے تم نے ایک کا دامن چھوڑا' اب کچھ عرصے کے بعد پھر اس کی طرف رجوع کر رہے ہو' تمہارا کیا دین ہے کونسا ایمان ہے؟۔ آپ عوام کو کوئی الزام مت دیجئے۔ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی تاریخ سیاسی قلابازیوں کی داستان ہے! ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!! جب تک وہاں سے کٹیں گے نہیں' کوئی احتجاجی سیاست مؤثر نہیں ہو گی۔

۳۔ موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام کیا ہے؟--- اسلامی انقلاب کے لئے "حزب اللہ" کی تیاری!۔ یہ حزب اللہ ان لوگوں پر مشتمل ہو جو اپنی ذات اور اپنے گھر کی حد تک اسلام کو نافذ کر چکے ہوں' شریعت قائم کر چکے ہوں۔ پھر وہ آپس میں جڑیں اور غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کی غرض سے ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت کر کے ایک انقلابی جماعت تشکیل دیں اور بتدریج نہی عن المنکر باللسان سے آگے بڑھ کر' جب مناسب قوت فراہم ہو جائے تو نہی عن المنکر بالید کی طرف پیش قدمی کریں۔ برائی کا راستہ طاقت سے روکیں اور اس راہ میں اگر جان کا نذرانہ دینا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کریں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اس کے سوا اصلاح احوال کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے علماء کو' دینی زعماء کو' مذہبی جماعتوں کی قیادتوں کو اس رخ پر غور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

اس صید گہِ جور میں کم ظرف ہیں صیّاد

(ڈاکٹر محبوب الحق کی گوہر افشانی پر پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کا ردعمل)

بدخواہ نہ ہو اس کا' یہ دولت ہے خداداد
کیا تو بھی ہے آتش کدہ و دیر کی اولاد
ہر روز کسی تازہ ستم کی ہمیں امید
ہر روز کوئی تازہ ستم ہوتا ہے ایجاد!
بہتر ہے کہ باقی نہ رہے' شاخ و ورق بھی
کیوں سرو فقط بارِ ثمر سے رہیں آزاد
چڑیاں ہیں تو سہمی ہوئی لرزاں ہیں مولے
اس صید گہِ جور میں کم ظرف ہیں صیّاد
یہ خانقہی شیر --- وہ دربار کے شاہیں
ہے کون یہاں صاحبِ دل ' بندۂ آزاد!
بیدار ہے جو آنکھ وہی آنکھ ہے نمناک
جو قلب ہے آگاہ' وہی قلب ہے ناشاد
کتبہ نہیں وہ جو ہو رقم لوحِ لحد پر
کتبہ تو ہے وہ یاد کہ سینوں میں ہو آباد
دشنام ترا حصہ کہ مقسوم ثنا ہے
کس کس طرح ' تجھ کو کرے مخلوقِ خدا یاد
کس کی یہ کرامت ہے کہ مزدور ہے بیکار
کس کا ہے کرم' ٹوٹ گیا تیشۂ فرہاد
یہ زہد کی شوکت ہے تو وہ شانِ تدبر
نیلام کے اموال' مدبر ہوں کہ زُہاد!!
"محبوب" چچا سام کے محبوب ہمارے
یارو ہے یہی عالمِ اسلام کی افتاد!!
تو ربِّ رحیم اور یہ رسی کی درازی
ہو گی تو درازی کی بھی مولا! کوئی میعاد
تاثیر ذرا سی بھی منوّر نہیں اس میں
شاید کہ نکلتی نہیں دل سے تری فریاد!

(شائع شدہ : نوائے وقت' ۸ مارچ ۱۹۹۶ء)

بحث و نظر

کیا موجودہ مسلمان حکومتیں "الجماعۃ" ہیں؟

سید وصی مظہر ندوی

علمی اور دینی حلقوں میں معروف ماہانہ مجلّہ "اشراق" جو مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے افکار و نظریات کا علمبردار ہونے کی شہرت رکھتا ہے اور جس کے مدیر اپنے مخصوص علمی اور تحقیقی اسلوب کے لئے معروف ہیں، اس مجلّے نے گزشتہ چند برسوں میں جمہور علماء اور مفکرین کے مسلّمہ مسائل سے اظہارِ اختلاف کا چونکا دینے والا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ بلاشبہ بعض مسائل میں اس مجلّے کی تحقیقات نے سوچ کی نئی جہتیں فراہم کی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بادل نخواستہ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ "تفرد" کا شوق فراواں اب اس درجہ بڑھ چکا ہے کہ خود اپنی تحقیقاتی کوششوں کے نامکمل ہونے کے اعتراف کے باوجود بعض مسلمہ مسائل میں جمہور کی رائے کو رد کر دینے کی جرأت بھی کی جانے لگی ہے۔ مثلاً نزول مسیح اور رفعِ سماوی کے بارے میں اس اعتراف کے باوصف کہ اس مسئلہ میں ابھی ان کی تحقیق جاری ہے، مسلمہ نقطہ نظر سے ہٹ کر نزول مسیح کا انکار کر دیا گیا۔

یوں تو "اشراق" کے ہر شمارے میں ایک سے زائد "تفردات" کا یہ سلسلہ جاری ہے لیکن گزشتہ سال کے رسائل میں "الجماعہ" کے حوالے سے بعض بڑے دلچسپ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ تفردات اور یہ شذوذ اس سوال کے جواب میں ہیں کہ بکثرت احادیث صحیحہ میں "التزام جماعت" کے سلسلہ میں جو احکام موجود ہیں اور "الجماعہ" سے علیحدگی اختیار کرنے والوں کے بارے میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان پر آج کا مسلمان کیا ردعمل

ظاہر کرے؟ جبکہ نبی ﷺ کی قائم کردہ "الجماعہ" اس وقت بظاہر کہیں موجود نہیں ہے۔

اس کے جواب میں بعض حضرات نے زور و شور کے ساتھ کہا ہے کہ اگر "الجماعہ" قائم نہیں ہے تو اسے قائم کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ بنابریں یا تو آدمی "الجماعہ" کے قیام کی کوشش خود کرے یا کسی اجتماعی جدوجہد میں شریک ہو جائے' ورنہ وہ "الجماعہ" سے الگ رہنے کی وعیدوں کا مخاطب ہو گا اور اپنے ایمان اور اعمال صالحہ کے باوجود اگر اسی حالت میں مرے گا تو اس کی یہ موت 'نعوذ باللہ' از روئے احادیث' جاہلیت کی موت ہو گی۔

اس استدلال کی ظاہری قوت و شوکت سے مرعوب ہو کر اپنے اپنے ایمان کی خیر منانے کے لئے لوگوں نے جو تاویلیں تلاش کی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے انوکھی تاویل و تحقیق اصحاب "اشراق" کی ہے۔ ان کا ارشاد ہے :

> "بعض لوگوں کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ کسی بھی ایسی تنظیم یا جماعت سے منسلک رہنا ضروری ہے جو غلبہ اسلام کے لئے کوشاں ہو۔ جماعت کے اس مطلب کی روشنی میں جس کو ہم نے اوپر واضح کیا ہے (یعنی یہ کہ الجماعہ اور السلطان مترادف اصطلاحات ہیں) یہ حکم ہمارے ملک میں "حکومت پاکستان" کے ساتھ وفادار رہنے اور اس کے قوانین کی پابندی کرنے سے پورا ہو جاتا ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت پاکستان ہی اس کی سرزمین کے مسلمانوں کے لئے "الجماعہ" ہے۔ (اشراق فروری ۱۹۹۴ء)

یہ تحریر اگرچہ زاویہ فراہی" کے ایک اسکالر جناب ساجد حمید کی ہے تاہم اس تحریر میں ضمیر "ہم" کا استعمال واضح کرتا ہے کہ یہ اس زاویہ اور اس کے سربراہ کی مجمع علیہ رائے ہے۔ زاویہ فراہی کے یہ سکالر اپنی رائے کو مبرہن کرتے ہوئے واضح فرماتے ہیں :

> "میں نے دین و شریعت سے یہی سیکھا ہے کہ مسلمان اگر کسی خطہ ارضی میں جمع ہوں اور اپنے اندر کسی شخص کو امیر (حکمران) بنالیں تو وہ الجماعہ ہیں۔ چنانچہ آپ کو فیصلہ بس اہل پاکستان کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے ہی کا کرنا ہے۔" (اشراق فروری ۹۶ء)

پھر جناب ساجد حمید کی بعض عبارتوں سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ مسلمان اپنی آزاد مرضی سے اگر کوئی حکومت قائم کریں تو وہ الجماعہ ہے۔ اس لحاظ سے محض نام نہاد

جمہوری انداز میں منتخب ہونے والی حکومتیں ان کے خیال میں "الجماعہ" ہوں گی جبکہ آمرانہ اور خاندانی بادشاہت پر مبنی حکومتیں غالباً "الجماعہ" کے معزز لقب کی حقدار نہ ہوں گی۔ جبکہ فاضل مضمون نگار کی بعض دیگر عبارتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ اگر بادشاہوں اور آمروں کی حکومتوں کو مسلمانوں نے عملاً قبول کر لیا ہو تو وہ بھی "الجماعہ" سمجھی جائیں گی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

"چنانچہ مسلمانوں کی کسی بھی حکومت کے لئے الجماعہ یا السلطان کے لئے پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ اس کے پاس اقتدار ہو اور مسلمان رعایا اس اقتدار کو تسلیم کرتی ہو"۔ (اشراق مارچ ۹۵)

مضمون نگار صاحب اپنی اس رائے میں اتنا غلو رکھتے ہیں کہ وہ کفر بواح کی مرتکب حکومت کو بھی الجماعہ قرار دینے میں تامل نہیں رکھتے جیسا کہ انہوں نے واضح فرمایا ہے کہ

"شریعت کی رو سے کفر بواح کی مرتکب حکومت بھی اس وقت تک "الجماعہ" ہے جب تک اسے عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہے"۔ (اشراق مارچ ۹۵)

(مضمون نگار کی سہل انگاری اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ "عامۃ المسلمین" کے بجائے "عامۃ الناس" ہی کے اعتماد کو کافی قرار دے رہے ہیں)

لیکن جب بعض اہل علم نے فاضل مضمون نگار سے سوال کیا کہ غیر مسلم حکومتوں میں جو مسلمان اقلیت آباد ہے وہ "الجماعہ" کے ساتھ التزام کے حکم پر کیسے عمل پیرا ہو تو مضمون نگار صاحب نے الجماعہ کے لئے خود اپنی طرف سے بیان کردہ "پہلی اور آخری شرط" (یعنی اقتدار کی موجودگی) کو فراموش کر دیا اور غیر مسلم حکمرانوں کے ماتحت رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کو "الجماعہ" قائم کرنے کا وہ نسخہ مرحمت فرمایا جو بڑے بوڑھے حضرات کی طرف سے از راہ مذاق بچوں کو چڑیاں پکڑنے کے اس چٹکلے کے عین مطابق ہے کہ "گرمیوں میں دوپہر کے وقت چڑیا کے سر پر موم رکھ دو' جب موم دھوپ کی گرمی سے پگھل کر چڑیا کی آنکھیں بند کر دے تو آرام سے جا کر اسے پکڑ لو"۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ کروڑوں مسلمانوں کی یہ آبادی متحد ہو کر ایک جماعت بنا لے اور اس کا امیر چن لے اور اگر بالفرض سب متحد ہو کر ایسا نہ کر سکیں تو کم از کم اکثریت اس عمل میں شریک ہو جائے' لیجئے بس

کروڑوں کی آبادی کی "الجماعہ" بن کر تیار ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ان مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ سب متحد ہو کر اپنے اندر کسی معتمد دینی شخصیت کو اپنا راہنما بنالیں اور اس کا انتخاب ان کے باہمی مشورے سے ہو۔ وہ اپنے مشورے میں' جس شخص پر' بالاجماع یا مجرد اکثریتی رائے سے اعتماد کا اظہار کریں اسے اپنا امیر مقرر کر لیں۔ امیر کے انتخاب کے بعد وہ بھی "الجماعہ" ہیں۔" (اشراق جنوری ۹۶ء)

واہ کیا آسان نسخہ ہے "الجماعہ" کی تشکیل کا!!

"زاویہ فراہی" کے ترجمان جناب ساجد حمید نے "التزامِ جماعہ" کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل قرآن وسنت میں التزامِ جماعت اور اطاعتِ امیر کے جو احکام دیئے گئے ہیں اور خروج یا الجماعہ سے علیحدگی کے بارے میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان کے اصل "محل" کی طرف سے غالباً نادانستہ صرف نظر پر مبنی ہے۔

دراصل یہ سارے احکام اور یہ تمام ہدایات اس وقت دی گئیں تھیں جب نبی اکرم ﷺ کی سربراہی میں مدینہ منورہ کے اندر مسلمانوں کی ایک بااقتدار "الجماعہ" قائم ہو گئی تھی۔ لفظ "جماعت" جو نکرہ (Indefinite) ہونے کی صورت میں ہر جماعت کے لئے بولا جا سکتا ہے اس پر "ال" (Definite Article) داخل ہونے کے بعد اس کا اطلاق صرف اس جماعت پر ہو گا جو نبی ﷺ کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی اور اس جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے کے جتنے احکام ہیں وہ سب اس وقت تک کے لئے ہیں جب تک یہ جماعت قائم رہے' لیکن جب یہ قائم نہ رہے' جیسا کہ اس وقت ہے' تو التزامِ جماعت کے یہ سارے احکام نافذ العمل نہ سمجھے جائیں گے۔ جس طرح ہر نماز اس وقت فرض ہوتی ہے جب اس کا وقت داخل ہو۔ اس سے قبل نماز کا حکم تو موجود رہتا ہے مگر نافذ العمل نہیں ہوتا' یا جس طرح حدود اور تعزیرات کے احکام اس وقت نافذ العمل ہیں جب وہ اجتماعی نظام موجود ہو جو ان کے نفاذ پر قادر ہو لیکن اس نظام کی عدم موجودگی میں عام مسلمان ان احکام کے مخاطب نہیں' نہ ان کے نفاذ کے مکلف ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ نبی ﷺ کی قائم کردہ "الجماعہ" تو سردست موجود نہیں ہے'

پھر کیا

(۱) ہم اس جماعت کو قائم کرنے کے مکلف ہیں؟ اور اگر جماعت قائم کرنے کے مکلف ہیں تو اس کا طریقہ کار کیا ہو گا؟

(۲) اور وہ کم سے کم کیا خصوصیات و شرائط ہیں جن کی موجودگی کی صورت میں کسی جماعت کو "الجماعہ" قرار دیا جا سکتا ہے؟

پہلے سوال کے جواب کے سلسلہ میں مجھے اس رائے سے مکمل اتفاق ہے جو "اشراق" ہی کے صفحات پر ظاہر کی گئی ہے کہ ہم مکلف صرف اصل دعوت پہنچانے کے ہیں ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم

(۱) مشرکین (ہر طرح کے مشرکین) کی پرواہ کئے بغیر توحید خالص کی صاف صاف دعوت دیں۔

(۲) عقیدۂ آخرت کو غیر مؤثر بنا دینے والے تمام تصورات کی نفی کرتے ہوئے ایمان بالآخرت کی طرف بلائیں۔

(۳) ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب کی دعوت دیں۔

(۴) توبہ (رجوع الی اللہ) اور استغفار کی دعوت دیں۔

یہ دعوت جتنی واضح، مداہنت سے پاک اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے مطابق ہو گی اتنی ہی شدت کے ساتھ مشرکین اور باطل پرستوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی جائے گی۔ اور ان مخالفت کرنے والوں میں جہاں سکہ بند مشرک ہوں گے [كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (الشوریٰ : ۱۳) "مشرکین پر سخت گراں ہے وہ دعوت جو تم ان کو پہنچا رہے ہو"] وہاں مخالفت کرنے والوں میں انبیاء علیہم السلام کے وہ نام نہاد وارث اور حاملینِ کتابِ الٰہی یا بالفاظ دیگر مسلمان کہلانے والے بھی ہوں گے جو اصل دعوت سے حقیقتاً منحرف ہو چکے ہیں لیکن محض اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مسلمانوں میں اپنا شمار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ

اُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذًى كَثِيْرًا
(آل عمران : ۱۸۶)

"اپنے مالوں اور جانوں کے سلسلہ میں تم کو ضرور آزمایا جائے گا اور ان گروہوں کی طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان لوگوں کی طرف سے جو شرک کے مرتکب ہیں تمہیں سخت تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی۔"

دعوت کی شدید مخالفت اور جان و مال کی آزمائشوں میں مبتلا کئے جانے کی وجہ سے دعوت قبول کرنے والوں کا تعلق داعی کے ساتھ مضبوط ہوتا چلا جائے گا اور ان کے درمیان باہم محبت و الفت' اخوت و مواسات کے رشتے قائم ہوتے چلے جائیں گے اور اس طرح "الجماعہ" کی تشکیل کا وہ فطری عمل شروع ہو جائے گا جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے اور اس دعوت پر ایمان لانے والوں کے طرز عمل سے تاریخ دعوت میں ہمیشہ شروع ہوتا رہا ہے اور جب یہ جماعت کسی خطہ میں اقتدار و اختیار کی مالک بن جائے گی تو یہی "الجماعہ" کہلانے کی مستحق ہوگی۔

مگر اس سارے عمل کے کسی بھی مرحلے میں داعی اور دعوت کو قبول کرنے والے نہ "الجماعہ" کو وجود میں لانے کی دعوت دیں گے اور نہ ہی خود کو کبھی "الجماعہ" کی حیثیت سے پیش کریں گے' مگر جب اقتدار حاصل کر کے یہ "الجماعہ" بن جائے گی تو پھر تمام مسلمانوں کو اسی سے مربوط رہنا پڑے گا۔

دوسرے سوال کے جواب میں گزارش ہے کہ

(۱) یہ تمام مسلمانوں کی جماعت ہوگی۔ اس میں شمولیت سے کسی مسلمان کو نہ جغرافیائی حدود کی وجہ سے' نہ لسانی اور نسلی اختلاف کی بنا پر روکا جا سکے گا۔

(۲) تمام مسلمان اس میں شامل ہوں یا کم از کم اس کو سوادِ اعظم کی تائید حاصل ہو۔

(۳) اس الجماعہ کا بنیادی مقصد "دعوت الی الخیر" اور اس کا اصل پروگرام امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اقامتِ صلوٰۃ' ایتاءِ زکوٰۃ اور قیامِ قسط و عدل کے لئے اللہ کی کتاب اور میزان (شریعت) کو نافذ کرنا ہوگا۔

(۴) چوتھی خصوصیت وہی ہے جس کو اشراق کے مضمون نگار نے پہلی اور آخری شرط

قرار دیا ہے یعنی اس جماعت کا صاحب اقتدار ہونا اور مسلمانوں کی اکثریت کا اس کے اقتدار کو تسلیم کر لینا۔

واضح رہے کہ زوال و انحطاط کے عمل سے اگر ان خصوصیات میں کچھ ضعف پیدا ہو جائے مثلاً یہ کہ دعوت الی الخیر' امر بالمعروف و نہی عن المنکر' نفاذ شریعت یا قیام قسط و عدل ٹھیک ٹھیک معیار کے مطابق نہ رہیں تو ان کوتاہیوں کی وجہ سے اس کے الجماعہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا نہ اس سے علیحدہ ہونا جائز ہو گا' نہ اس کے خلاف خروج و قتال کی اجازت ہو گی۔

اس قسم کی الجماعہ کی موجودگی میں تمام مسلمانوں کو اس کے ساتھ مربوط رہنے کا حکم دیا گیا ہے' اس میں انتشار پیدا کرنے والے کو واجب القتل قرار دیا گیا ہے' اس سے علیحدگی اور دوری کو جہنم کی طرف جانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور علیحدگی کی حالت میں موت کو جاہلیت کی موت قرار دیا گیا۔

اس الجماعہ میں بگاڑ پیدا ہونے کی صورت میں اس کی اصلاح کی جدوجہد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر جب اس الجماعہ کے حکمرانوں کی طرف سے "کفر بواح" کا اظہار ہو جائے تو ان کے خلاف طاقت کے استعمال کو انہی شرائط کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا ہے جن شرائط کے ساتھ کسی بھی کافرانہ نظام کے خلاف طاقت کا استعمال لازم ہو جاتا ہے۔

کفر بواح کے ارتکاب کے بعد کسی اقتدار کی حیثیت "الجماعہ" کی نہیں رہتی۔ ایسے اقتدار کے ساتھ مومن کا اصل تعلق محاربہ کا ہو جاتا ہے' اگرچہ عملاً محاربہ کرنے کے لئے اسلام نے چند اہم شرائط عائد کر دی ہیں جن کے بغیر نہ کفر بواح کے مرتکب نام نہاد مسلمان حکمرانوں کے خلاف طاقت استعمال کی جا سکتی ہے نہ کافر حکمرانوں کے خلاف۔ کافر حکمرانوں اور کفر بواح کے مرتکب نام نہاد مسلمانوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ جب بھی کسی بااختیار امیر کی قیادت میں مسلمانوں کی کوئی جماعت وجود میں آ جائے اور اس کے پاس اتنی مادی طاقت بھی فراہم ہو جائے کہ کافرانہ حکومت کو کامیابی کے ساتھ ہٹانے کے واضح امکانات نظر آ رہے ہوں تو ان کے خلاف محاربہ صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ واجب ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ (البقرہ)

"اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت (صرف) اللہ کے لئے ہو جائے"

"اشراق" کے مضمون نگار کا فتویٰ یہ ہے کہ کفر بواح کی مرتکب حکومت "الجماعۃ" رہتی ہے' بس اس کے خلاف طاقت کا استعمال جائز ہونے کی ایک علت البتہ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "واَن لاننازعَ الامرَ اهلَهٗ اِلّااَن تروا کفرًا بواحًا" سے منازعتِ امر (خروج) کا واجب ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا' زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سے منازعت کے وجوہ جواز میں سے ایک وجہ کفر بواح بھی ہے۔ منازعت کے واجب نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس منازعت سے گریز بھی کیا جا سکتا ہے بلکہ اگر شرائط پوری نہ ہو رہی ہوں تو اس منازعت سے گریز ہی دین کی منشا ہے۔" (اشراق مارچ ۹۵ء)

میری گزارش یہ ہے کہ ہمارے دین میں قتال اور حکمرانوں سے طاقت کے ذریعہ اقتدار چھیننے کی صرف دو قسمیں ہیں (۱) حرام یا ناجائز (۲) واجب ---- "قتال جائز" کا تصور ہمارے دین میں موجود نہیں کہ جی چاہے تو قتال شروع کر دو اور جی نہ چاہے تو قتال نہ کرو۔ نہیں' انسانی جان کے احترام کی وجہ سے قتال حرام ہے' اِلّا یہ کہ کسی اعلیٰ تر ضرورت یا مصلحت کی وجہ سے قتال واجب ہو جائے۔

رہی یہ بات کہ "کافرانہ حکومت" کو دیکھتے ہی اس کے خلاف "بزن" کیوں نہیں بول دیا جاتا یا کفر بواح کی مرتکب حکومت کے خلاف فی الفور تلوار کیوں نہیں سونت لی جاتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ طاقت کے استعمال کے لئے کچھ ضروری شرائط ہیں' یہ شرائط اگر پوری نہ ہوں تو طاقت کا استعمال جائز نہیں' اور اگر پوری ہو جائیں تو پھر طاقت کا استعمال کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اشراق کے فاضل مضمون نگار ذرا دیر کے لئے فرض کریں :

(الف) حکومت کفر بواح کی مرتکب ہے

(ب) مسلمان ایک با اختیار امیر کے تحت منظم ہیں

(ج) مسلمان تعداد اور وسائل کے لحاظ سے کفر بواح کی مرتکب حکومت ہٹانے کی نظر بظاہر صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

تو کیا اس صورت میں ان کے لئے جائز ہو گا کہ وہ "کفر بواح" کی حکومت کو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق دیکھتے رہیں اور کچھ نہ کہیں۔

فاضل مضمون نگار نے ایک دلچسپ استدلال یہ کیا ہے کہ

"چنانچہ اگر کفر بواح کے بعد منازعت سے گریز کیا جا سکتا ہے اور بعض حالات میں گریز ہی دین کی منشا ہے' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حکومت کو کفر بواح کے بعد بھی مطاع مانا گیا ہے اور وہ اب بھی "الجماعہ" ہے۔" (اشراق مارچ ۱۹۹۵ء)

سبحان اللہ وبحمدہ! عزیز من! کفر بواح کی مرتکب حکومت یا کافروں کی حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے اگر ملکی قوانین کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے تو اس کی علت یہ نہیں ہے کہ یہ حکومتیں "الجماعہ" ہیں بلکہ اس کی علت "فساد فی الارض" سے احتراز ہے' لیکن جونہی اہل ایمان اس قابل ہو جائیں کہ کفر کی حکومت کی جگہ اللہ کی بادشاہت اور شریعت کی حکمرانی قائم کر سکیں تو ان پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ ایسا کر گزریں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ○ (النساء : ۷۵)

"تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے جبکہ کمزور بنا کر رکھے جانے والے مرد' عورتیں اور بچے کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو اس بستی سے نکال جس بستی والے ظالم ہیں اور اپنے پاس سے ہمارا کوئی سرپرست بنا اور اپنے پاس سے ہمارا کوئی مددگار بنا۔"

اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ "اطاعت" کے مفہوم میں خوش دلی کے ساتھ حکم کی بجا آوری کا تصور پایا جاتا ہے اور احکام کی اس طرح سے بجا آوری اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اور ان اولوالامر کے ساتھ مخصوص ہے جو مسلمانوں میں سے ہوں' کافر اور کفر بواح کے

مرتکب حکمرانوں کے لئے اطاعت کا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

اب آخر میں میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دورِ حاضر کی مسلم حکومتیں' نام نہاد جمہوری حکومتیں' آمرانہ حکومتیں اور بادشاہتیں--- حسب ذیل وجوہ کی بنا پر الجماعہ نہیں ہیں :

(۱) نام نہاد جمہوری حکومتوں میں ان ملکوں میں آباد غیر مسلم بھی برابر کے شریک ہیں جبکہ "الجماعہ" کا اطلاق صرف مسلمانوں کی جماعت پر ہوتا ہے۔

(۲) ان میں سے کسی حکومت میں نہ دنیا کے تمام مسلمان شریک ہیں نہ سوادِ اعظم۔ ان حکومتوں میں صرف ان لوگوں کو شرکت کی اجازت ہے جو مخصوص جغرافیائی حد کے اندر رہتے ہوں۔ اس سے باہر رہنے والا کوئی مسلمان محض مسلمان ہونے کی بنا پر اس "الجماعہ" میں شامل نہیں ہو سکتا' جو سراسر "الجماعہ" کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ پاکستان نے تو ان مسلمانوں کو بھی غیروں کا غیر قرار دے دیا ہے جو پاکستان بنانے میں برابر کے شریک تھے مگر وہ بھارت میں رہ گئے اور پھر پاکستان نے ان کے لئے اپنے دروازے بند کر دیئے' بلکہ پاکستان تو بنگلہ دیش میں محصور پاکستانیوں کو بھی اس نام نہاد "الجماعہ" میں شریک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

(۳) احادیث صحیحہ کی رو سے' نیز خود لفظ "الجماعہ" سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی الجماعہ سارے عالم میں بس ایک ہی جماعت ہو سکتی ہے۔ بیک وقت کئی الجماعتوں کا وجود تناقض فی الاصطلاح ہے' نیز اس سے لازم آتا ہے کہ ایک حکومت میں رہنے والا مسلمان "الجماعہ" میں شامل ہونے کی وجہ سے الجماعہ میں شمولیت کی بشارتوں کا بھی مستحق ہو اور دوسری الجماعتوں میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے وعیدوں کا مستحق بھی۔

(۴) ان میں سے کسی ریاست یا حکومت سے الگ ہو کر کسی دوسرے ملک میں چلا جانے والا یا ان میں سے کسی ریاست سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص نہ واجب القتل ہے نہ اس کی علیحدگی جہنم کی طرف لے جانے والی ہے نہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

گوشۂ خواتین

سچائی

طیبہ یاسمین' لاہور

سچائی کے خلاف بڑے سے بڑا گناہ گار اور ملحدانہ نظریات رکھنے والا بھی اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ خواہ اس کا اپنا عمل سچائی کی نفی کرتا ہو مگر اپنی تحریر و تقریر میں وہ ہمیشہ سچ کی پاسداری کرتا نظر آتا ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ بعض اوقات وہ حقائق سے آنکھیں موڑ کر جھوٹ کو سچائی کا روپ دے دے۔ مگر کہتا وہ خود کو سچا ہی ہے کہ بقول شاعر ع کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے!

دراصل انسان کی فطرت سچائی پر پیدا کی گئی ہے اور وہ سچائی ہی پسند کرتا ہے۔ میں بھی کچھ "سچ" ہی کے بارہ میں خامہ فرسائی کی کوشش میں ہوں۔ تاہم میں باطنی سچائی پر کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

باطن کی سچائی میں انسانی تعلقات میں سچائی سرفہرست ہے۔ محبت کی سچائی بڑی اچھی چیز ہے۔ ملاوٹ کے اس دور میں یہ جتنی بھی مل جائے اسے خوشی خوشی لے لینا چاہئے۔ انسانی تعلقات' رشتہ داری' دوستی' ہمسائیگی' مسافرت وغیرہ میں سچائی ہو' دکھاوا نہ ہو۔ محبت بے شک تھوڑی ہو' اظہار تھوڑا ہو مگر سچا ہو۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ "تھوڑا کھاتے ہیں مگر خالص کھاتے ہیں"۔ وہی بہتر نتائج ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح محبت کی سچائی جو ملاوٹ سے پاک ہو۔ بے تحاشا اور اوپر اوپر سے واری صدقے جانے اور اندر سے جڑیں کھوکھلی کرنے والے اظہار سے بہتر ہے۔ گویا تھوڑا سا خالص دودھ بھرے ہوئے پانی ملے برتن سے بہتر ہے۔ سچی محبت وہی ہے جو ضرورت پڑنے پر ہمدردی اور حمایت کر سکے۔ ایسی بے تحاشا اور ظاہری محبت کا کیا فائدہ جو وقت پڑنے پر مصلحتوں اور بے نیازیوں کی بھینٹ چڑھ جائے۔

مہمان نوازی میں بھی دل سچائی مانگتا ہے۔ یہ اتنی ہی ہو جتنی سچی، اصلی اور خوشی خوشی کی جائے۔ جو حاضر ہے دل و جان سے حاضر ہے۔ صرف خود کو مہمان نواز ثابت کرنے کی خاطر تکلیف اٹھانے اور دوسرے کو مصیبت سمجھنے سے کیا حاصل؟ اور اگر کبھی اس راہ میں تکلیف اٹھانی بھی پڑ گئی ہے اور مہمان نوازی کرنی ہی ہے تو پھر اتنی مشقت اور کیوں نہ اٹھائی جائے کہ اس میں اپنی سچائی، خلوص اور محبت بھی شامل کی جائے، تاکہ یہ تو نہ ہو کہ زبان تو مہمان کو مزید کھانے اور تھوڑی دیر اور رک جانے کو کہہ رہی ہو اور دل کوسنے دے رہا ہو کہ بجٹ کا ستیاناس کر دیا اور وقت برباد کر دیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے میں چہرہ دلی جذبات ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا اور بعض مہمان بھی بڑے نازک طبع اور ذہین ہوتے ہیں اور یوں میزبان کی اپنی ہی سبکی ہوتی ہے۔ ایسے میں میزبان ہی قابل ملامت ہے نہ کہ بے چارہ مہمان جو اتنی آؤ بھگت دیکھ کر ویسے ہی شرمندہ اور احسان مند ہوا جا رہا ہے۔ وہ میزبانی بڑی پیاری ہو گی جس میں کھلے دل سے خلوص اور سچائی ہو نہ کہ دولت اور سلیقہ کا اظہار۔ اور پھر طبیعت یہ بھی چاہتی ہے کہ سلیقہ کے اظہار میں بھی سچائی ہو۔ یہ نہیں کہ ویسے تو گھر گندگی کا ڈپو بنا رہتا ہو مگر مہمان پر اپنی نفاست اور صفائی پسندی کی دھاک بٹھانے کے لئے اس روز پورا گھر نہایا دھویا اور صاف ستھرا لگ رہا ہو اور پھر جب مہمان چلا جائے تو "تماشا ختم" کے اعلان کے ساتھ ہی وہی گندگی، میلے بستر اور برتن اور کپڑوں کے ساتھ اہل خاندان کی آنکھ مچولی شروع ہو جائے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو کہ گھر ویسے بھی صاف ستھرا ہو کہ مومن کا نصف ایمان صفائی ہے اور مہمان کی عزت افزائی کے لئے مزید نکھار پیدا ہو، نہ کہ اظہار برتری و دولت کے لئے۔ کیا یہ جھوٹ اور منافقت نہیں کہ اصل کچھ ہو اور نظر کچھ آئے؟

ہر انسان سچائی، خلوص اور محبت کا بھوکا ہے، خواہ وہ اس پر عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ جو ظاہر داری کا پرچار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "دنیا بھی تو رکھنی پڑتی ہے" مگر کیا دنیاداری قائم رکھنے کے لئے جھوٹ کی ضرورت ہے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ انسان جو کچھ بھی کرے وہ سچائی کے ساتھ کرے۔ ظاہر کے ساتھ باطن کو بھی شریک کر لیں تو سچی خوشی تبھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے لئے انسان کو صرف یہ کوشش کرنی پڑتی ہے کہ دل حسد، کدورت،

کینہ' بغض' نفرت اور عداوت سے پاک ہو کر خلوص' ہمدردی' خیر خواہی اور محبت کا سرچشمہ ہو۔ جیسے بھی جذبات ہوں ان کی پرورش اور نشوونما کے لئے محنت اور کوشش سے کام لئے بغیر بات نہیں بنتی۔ تو جو کوشش خوشامد اور منافقت کے اظہار کے لئے کی جائے وہی سچے اور مثبت جذبات کے لئے کیوں نہ ہو؟ خوب و ناخوب کے اظہار کا ایک ہی معیار تو نہ ہو کہ سب اچھا' ورنہ پھر بقول شاعر ع "کس کا یقین کیجئے' کس کا نہ کیجئے!" والی بات ہو جاتی ہے۔ یہ کیسی مضحکہ خیز صورت حالات ہے کہ بُری اور اچھی چیز ایک جیسی تحسین و تعریف پاتی ہے' مزے دار اور بدمزہ کھانے کی تعریف یکساں ہے۔ دل شکنی ضروری نہیں مگر غلط فہمی بھی تو نہ ہو کہ اس صورت میں بہتری کی گنجائش نہیں رہتی' چرچل نے سچائی کا اظہار یوں کہہ کر بھی کیا تھا "اس ہال کے آدھے لوگ بے وقوف نہیں"۔

یاد رکھنے اور قابل غور بات یہ ہے کہ سچے جذبات کو بہت کم اظہار کی ضرورت ہوتی ہے' وہ آپ کے روئیں روئیں سے آشکار ہوتے ہیں اور دوسرے پر گہرا پائیدار اثر چھوڑتے ہیں۔ وہ ایسی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار کی مانند ہوتے ہیں جو تپتی دھوپ کی تلخی کو سکون و راحت میں بدل دیتے ہیں۔ سچائی کا راستہ اختیار کرنے سے انسان اپنے پاؤں اپنی چادر ہی میں رکھتا ہے' وہ جھوٹ کے ذریعے اپنی چادر کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا' جس سے معاشرتی اور ثقافتی روگ نہیں پلتے۔ سچائی بڑی گہری اور مؤثر ہوتی ہے۔ وہ انسان کے اعمال و اقوال کو قابل اعتماد بناتی ہے۔ وہ بے شمار دکھوں اور فکروں کا علاج ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے یا اس پر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ کڑوا سچ نہیں ہوتا بلکہ وہ غضب اور غصہ ہوتا ہے جو سچ کا لبادہ اوڑھ کر باہر نکلتا ہے اور سچ کو بدنام کرتا ہے۔ آخر سچائی بڑے اور بدبودار الفاظ و احساسات کا لبادہ اوڑھ کر ہی کیوں نکلتی ہے۔ وہ مٹھاس' اخلاق' مروت اور شرافت کا روپ دھار کر بھی تو ظاہر ہو سکتی ہے۔ سچ کی عادت ہو جائے تو خواہ مخواہ کی بہانہ بازیاں کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی اور نہ ہی کسی کو بے اعتباری ہوگی۔ پیارے نبی ﷺ نے بھی تو آخر ایک چور کو سچائی کے ذریعے ہی بہتر انسان بنایا۔

اپنی توانائی اس حسین کائنات کو مزید حسن اور سکون بخشنے میں کیوں نہ صرف کی جائے کہ کائنات سراسر سچائی پر قائم ہے۔ کسی حقدار کا حق ادا کرنا بھی سچائی ہے۔ جھوٹ نیکی کی

حق تلفی کرتا ہے۔ سچائی میں سکون اور بھلائی کی بے بہا دولت پوشیدہ ہے۔ جھوٹ میں سراسر بدامنی' خوف و فساد اور بے چینی ہے اور پھر فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مومن اور تو کچھ ہو سکتا ہے مگر جھوٹا نہیں!!

ناک کٹنے کا مسئلہ

ہمارے معاشرے میں ہی نہیں ہر معاشرہ میں ناک کٹنے کا مسئلہ بڑے زور و شور سے موجود ہے۔ ناک کٹنے کا مطلب ہے کہ اپنے معاشرے' اپنے ماحول اور ارد گرد کے باسیوں میں انسان کی سبکی ہو اور وہ ماحول کے معاشرتی تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو۔ ناک کٹنے کا باعث رائج الوقت رسوم اور طور طریقوں سے انحراف ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ صرف ایک ہی طرح اور ایک ہی طرز کے خیالات و عادات کا حامل نہیں ہوتا۔ اس میں ہر قسم اور ہر درجہ کی ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ایک بات ایک کے لئے باعث عار ہے تو وہی دوسرے کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے۔

معاشرہ میں بے شمار گروہوں کی تقسیم کی وجہ سے ہر کسی کی ناک کٹنے کا مسئلہ متفرق وجوہات سے ہوتا ہے۔ معاشرہ میں ناک نہ کٹوانے کا مطلب اپنی عزت و آبرو کو سماج میں محفوظ کرنا ہوتا ہے۔

اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسانی معاشرہ کے بے شمار گروہ' بے شمار اقدار اور بے شمار معیارات ہیں تو انسان اپنی ناک کٹنے سے کیسے محفوظ رکھے۔ اگر وہ ایک کو خوش کرے گا تو دوسرے کو ناراض۔ جس کو ناراض کیا وہاں سبکی ہو گئی یا دوسرے الفاظ میں ناک کٹ گئی انسان کسی نہ کسی طبقہ یا گروہ سے ضرور متعلق ہوتا ہے۔ کوئی تنگ نظر' کوئی روشن خیال' کوئی لادین اور کوئی دیندار۔ ہر انسان جس گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہے اس کی ناک اسی طبقہ یا گروہ کو خوش رکھنے سے بچ سکتی ہے۔ ایک اسلامی نظریہ رکھنے والے شخص کی ناک غیر اسلامی افعال کے سرزد ہونے سے کٹتی ہے اور غیر اسلامی نظریات کے حامل شخص کی ناک اسلامی نظریات پر عمل کرنے سے' تنگ نظر اور بنیاد پرست و رجعت

پسند کہلا کر کٹتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ انسان کے لئے ہر کسی کو خوش کرنا تو ممکن نہیں۔ اپنے نظریات' اپنی تہذیب اور خیالات کی حفاظت ہر کسی کو مطلوب ہے۔ اور ایسا کرنا تبھی ممکن ہے جب انسان دنیا کے بے شمار گروہوں میں سے اپنا گروہ تلاش کر کے اس میں شامل ہو۔ وہ وہیں پنپ سکتا ہے۔ دوسری جگہ وہ محض اجنبی ہو گا۔ چونکہ انسان اللہ کا بندہ ہے تو وہ اس کے بندوں کے ایسے گروہ میں شامل کیوں نہ ہو جہاں اس کے لئے اللہ کی بندگی آسان ہو اور انسانوں کو خوش کرنے کی ذلت آمیز تقدیر اس کے مقدر میں نہ ہو۔ اس کی ناک صرف بندگیٔ رب کے راستے سے بھٹک جانے پر ہی کٹے گی۔ اور انسان کے لئے یہ بڑی ہی شرمناک بات ہے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کو خوش کرنے کی ناممکن کوشش کرے۔

اگر ایسا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کو ان کے حوالے نہیں کرتا اور ان کو سکون اور مدد عطا فرماتا ہے۔ تو خوش اسی کو کیوں نہ کیا جائے اور اپنی عزت و آبرو اور ناک کی حفاظت اسی کی خوشی سے کیوں نہ حاصل کی جائے جس سے ہماری دائمی خوشیاں وابستہ ہیں۔ اسی سے وابستگی میں فائدہ اور کامیابی ہے۔ دوسرے معیارات تو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے ہی رہتے ہیں۔ بقول شاعر۔

یہ کہہ کے ٹوٹ گئی میرے پاؤں کی زنجیر
کہ جو غلام خدا کا ہے وہ غلام نہیں!

اور۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

بقیہ : بحث و نظر

البتہ موجودہ تمام مسلم حکومتیں' اسی طرح مسلمانوں کی رضاکارانہ طور پر منظم ہونے والی دینی یا سیاسی جماعتیں اطاعت فی المعروف کی مستحق ہیں اور ان کے اس حق کی بنیاد وہ معاہدۂ عمرانی ہے جو خود مضمون نگار کے استدلال کے مطابق سورۃ المائدہ کی آیت : يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ (اے ایمان لانے والو معاہدوں کو پورا کرو) سے مستنبط ہے اور اس آیت کے حکم کے مطابق واجب الاتباع ہے۔ ○ ○

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REG No. L 7360
Vol. 45 No. 4
April – 1996

NOW AVAILABLE

The Inaugural Issue of

The
Qur'anic Horizons

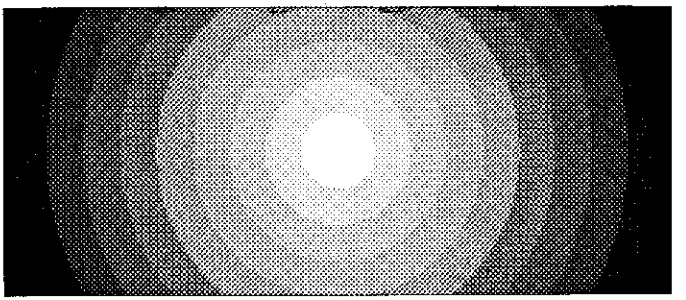

Price per issue: Rs. 30/- Annual Subscription: Rs. 100/-

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an
36-K, Model Town, Lahore-54700